چند تاریخی گوشے

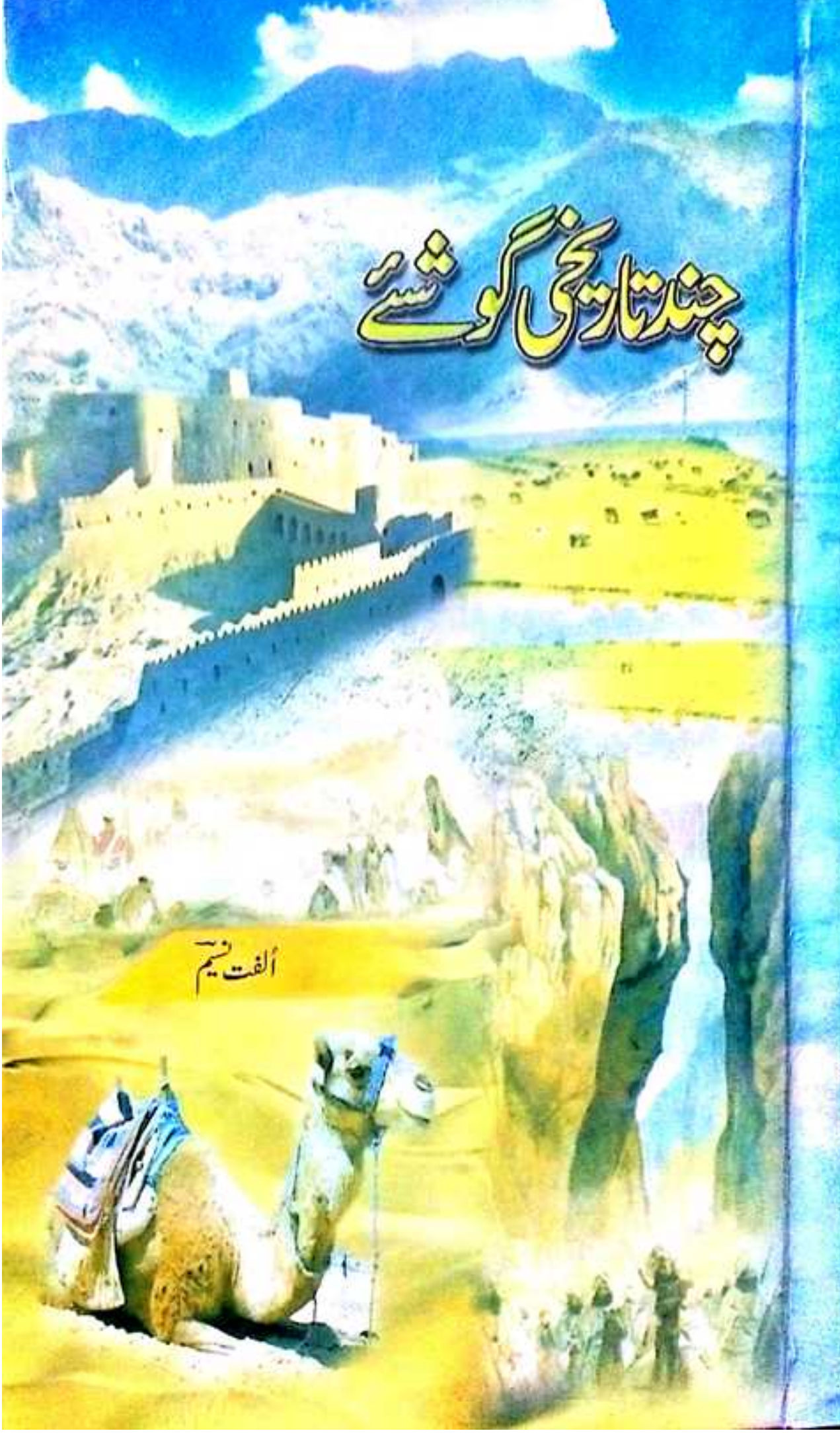

اُلفت نسیم

تاریخ نسیمی -5-

بلوچ اور بلوچستان

چند تاریخی گوشے

اُلفت نسیم

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

بلوچ اور بلوچستان.....

کتاب کا نام	:	چند تاریخی گوشے
مصنف	:	اُلفت نسیم
کمپیوٹر کمپوزر	:	عزیز جمالدینی
ٹائیٹل	:	طارق قاضی
پرنٹرز	:	ہائی ٹیک پرنٹرز
سالِ اشاعت	:	2008
تعداد	:	500
قیمت	:	200 کلدار

ISBN NO.978-969-8557- 57-7

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
1۔	ابتدائی کلمات	5
2۔	میر کبیر رئیس	7
3۔	کلاتِ سیوا	53
4۔	براہوا تحادیہ (براہوئی) کی منظوم تاریخ	72
5۔	نمرود..... حقیقتاً بلوچ تھا۔	182
6۔	نمرود قلات	194
7۔	کراچی کی تاریخ بلوچ پس منظر میں	214
8۔	بلوچ و پشتون کی ملّی وحدت کے تاریخی شواہد پر ایک نظر۔	244
9۔	کیچ	254
10۔	شال	261
11۔	کوہستانِ خضدار کی رابعہ۔	266
12۔	سہتی مراد	280
13۔	حضرت شہباز قلندر بلوچستان میں	288

ابتدائی کلمات

زیرِ نظر کتاب بلوچ اور بلوچستان کی بکھری ہوئی تاریخ سے مربوط مختلف تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے۔ جن کے پس منظر میں بلوچ اور بلوچستان کی تاریخ کے کئی چھپے ہوئے گوشے عیان ہیں۔ جن کا کھوج اس سے پہلے محققین اور مورخین نے نہیں لگایا۔ یقیناً بلوچی دنیا کا طالب علم ان کے مطالعہ سے نہ صرف مستفید ہوگا بلکہ ممکن ہے کہ ان تاریخی گوشوں کی وسعت کی جستجو میں اس سلسلے کو مزید آگے بڑھائے۔

مذکورہ تحقیقی مضامین میں سے چند ایک کراچی اور بلوچستان کے رسائل اور اخبارات میں طبع بھی ہو چکے ہیں۔ جو بلوچ اور غیر بلوچ قارئین کے مطالعہ میں آ کر مقبولیت پا چکے ہیں۔ اور ان کا اصرار ہے کہ ان مضامین کی بار بار تشہیر کی جائے اور مزید تحقیق کر کے دیگر پس پردہ گوشوں تک پہنچا جائے۔ ایسے دوستوں کے لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ قلم سنبھال کر اور کمر کس کر خود آگے بڑھیں اور بلوچ تاریخ کی تحقیق اور جستجو میں اپنا بھی کردار ادا کریں۔ جو کچھ اس کتاب میں ہم پیش کر رہے ہیں وہ اسے بنیادی یا ابتدائی قدم جان کر آگے پیش رفت کریں۔ یہ قومی اور اجتماعی اور ادارتی

کام ہے۔ایک شخص ہر شعبے اور ہر گوشے کی تحقیق اور جستجو نہیں کر سکتا۔

ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ بلوچ اور بلوچستان کی ہزاروں سالوں کی قدیم زرخیز تاریخ کا ادراک رکھنے والے اہل قلم اپنی توانائیاں محض غزل گوئی اور افسانہ نگاری میں ضائع نہیں کریں گے اور تاریخی تحقیقی میدان میں اُتر کر تاریخی حقیقوں سے بلوچی اور غیر بلوچی دنیا کو آگاہ کریں گے۔اور بلوچستان کی تاریخ کے خوبصورت چہرے پر سے جھوٹے تاریخ نویسوں اور جعلسازوں کے سجائے ہوئے مفروضوں کے سیاہ دھبوں کو دھولیں گے۔اور ان کی دروغ گوئیوں کو بے نقاب کریں گے۔

میں بلوچی اکیڈمی کے ارباب اختیار کا نہایت ہی ممنون ہوں کہ انہوں نے ہماری کاوشوں کی نشرواشاعت کا بیڑا اُٹھا کر ہمیں مزید کام کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔

ألفت نسیم۔حب بلوچستان

15 ستمبر 2008ء

میر کبر رئیس

قدیم سلطنت مکران (۱) اور مُلک سیستان (۲) کے پیچ پیچ پر دو تاریخی اقوام کے تہذیبی نقوش ہزاروں سالوں سے موجود چلے آ رہے ہیں۔ جہاں سینکڑوں سالوں تک ان کے کلچر کا سورج غروب نہیں ہو سکا تھا۔ اور یہاں قدم قدم پر ان کی دلیری اور شجاعت کے قدیم آثار بکھرے پڑے ہیں۔ جو تحریری تاریخ کے صفحات کی زینت نہیں بن سکے ہیں۔ یہ دو تاریخی مارشل اقوام تُرک اور بلوچ تھے۔ شام و عراق کے میدانوں اور پہاڑوں سے لے کر بلخ و بخارا اور پھر جنوب کی سمت بحر بلوچ تک قدم قدم پر انہی دو قوموں کے تاریخی و تہذیبی آثار موجود ہیں۔ جس مقام پر ترک قبائل کی تاریخی بود و باش اور عسکریت نظر آتی ہے وہیں پر بلوچ قبائل کے تہذیبی آثار بھی ملتے ہیں۔ جہاں تُرک خانہ بدوش مال چرائی کرتے نظر آتے ہیں وہیں پہلو میں بلوچ خانہ بدوشوں کے گدانوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔

جہاں ترک قبائل کی فصیل بند آبادیاں اور قلعے ملیں گے وہیں پر بلوچ قلعہ بند بھی ملیں گے۔ ایسے لگتا ہے کہ دونوں مارشل نسل ایک ہی بنیاد سے جنم لے چکے ہیں۔ جن کی پہاڑیاں، جن کے میدان اور جن کے سرسبز

وشاداب کھیت کاریزیں اور چراگاہیں اس وسیع وعریض خطے میں ہر جگہ ساتھ ساتھ اور منسلک ہیں۔ جو ان کی مشترک بنیاد کی نشاندہی کرتی ہیں۔ سیستان اور مکران کی سرزمینوں پر چراگاہوں اور قلعوں پر بالادستی پانے کی صدیوں تک لڑائیاں بھی یہی دو اقوام لڑتے چلے آرہے ہیں۔ ان تاریخی لڑائیوں کے تذکرے غزنوی دور کے مشہور شاعر ابوالقاسم فردوسی نے بھی اپنے شاہنامہ میں وضاحت سے کئے ہیں۔

موجودہ مکران کا اکثریتی قبیلہ رئیس، مندرجہ بالا تاریخی سرزمینوں کا قدیم حکمران قبیلہ رہا ہے۔ تُرک نسل کا یہ قبیلہ زمانہ قدیم سے حاکم ہونے کی بنا پر ''رئیس'' کا نام پاچکا ہے۔ جو اپنے کو سرزمین مکران کا ''بیج دار'' یعنی ''بنیادی'' قبیلہ کہتا ہے۔ اور جو صدیوں سے بلوچوں کا معزز ترین قبیلہ سمجھا اور مانا جاتا ہے بہادری اور نام آوری میں بھی یہ قبیلہ پیش پیش رہا ہے۔ جس نے بلوچ عوام کو قابل حکمران مہیا کئے ہیں۔ اس مجاہد قبیلہ نے ایسی بے شمار شخصیات کو جنم دیا جنہوں نے تلوار کے دھنی بن کر تاریخ میں نام اور مقام پیدا کیا ہے۔ ایسا ہی ایک مرد میدان ''میر کمبر رئیس'' تھا۔ جو قلات میں بلوچ حکمرانی اور جدید بلوچستان کا بانی ہے۔

میر کمبر رئیس اپنے زمانے کے سیستان و بلوچستان کے ان چند

جرنیلون میں سے تھا۔ جس نے اپنی اور اپنے قبیلہ بور سوار (۳) کی بہادری اور جرات کو ظلم وبربریت اور جارحیت کے خلاف استعمال کیا اور فتوحات میں نام پیدا کیا۔ وہ ہر جگہ اپنے بور سوار قبیلہ کے ساتھ ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا اور ظالم کو مغلوب کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دیتا۔ اُسے دشمن کی عددی اکثریت یا اُس کی جنگی صلاحیت کبھی بھی مرعوب نہیں کرسکتی تھی ۔اُسے لڑنے کے لئے کامیاب منصوبہ بندی کرنے اور ہر حال میں مد مقابل پر غالب آنے کی قدرتی صلاحیت حاصل تھی۔

میر کمبر رئیس ایک تجربہ کار لڑاکو تھا جو دونوں ہاتھوں میں تلوار لے کر لڑسکتا تھا۔ وہ اکثر سپر استعمال نہیں کرتا تھا اور دوران جنگ اپنے حواس قابو میں رکھتا تھا اور اپنے ساتھ لڑنے والے اپنے ساتھیوں کی ہمہ وقت خبر رکھتا تھا۔ دوران لڑائی وہ اپنے قریب راہزنوں کی ایک ٹیم ساتھ رکھتا تھا ۔(4) جو لڑتے نہیں تھے لیکن لڑائی کی ایک ایک کیفیت پر نظر رکھتے تھے اور دوران جنگ اپنے جرنیل کو ہر چیز سے باخبر رکھتے تھے اور اپنا دفاع بھی کرتے تھے۔

میر کمبر رئیس ایک بہترین شاہسوار بھی تھا لیکن میدان جنگ میں وہ پیدل ہی لڑتا تھا اور ہمیشہ اپنے جنگی لشکر کی خود کمان کرتا تھا۔ جب وہ

دشمن کے خلاف لڑنے جاتا تو اس کے ساتھ اس کے علاقے کے عوام کی دعائیں ہوتی تھیں ۔لوگ راتیں جاگ جاگ کر انتظار میں بیٹھے رہتے کہ کب میر کمبر کے فتح یاب ہونے کی خوشخبری پہنچ جائیگی اور جونہی فتح کی خبر پہنچ جاتی تو قبائل ڈھول دماموں کے ساتھ اس کے آگے جاتے اور شاندار استقبال کرتے اور پھر ہفتوں تک میر کی فتح کا جشن مناتے۔ لوگ دور دور سے اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کئی کئی دنوں کا پیدل سفر کر کے آجاتے اور اس سے مل کر فخر محسوس کرتے اور اسے اپنی اور اپنے قبائل کی خدمات پیش کرتے تھے۔

میر کمبر کی بہادری کی داستانیں اُس کی جوانی ہی میں ایران سیستان و بلوچستان کے چپے چپے تک پہنچ چکی تھیں ۔اور بلوچ پہلوان (5) جگہ جگہ بلوچی دیوانوں اور کچہریوں میں اس کی فتوحات کی منظوم داستانیں سناتے تھے۔جن میں نہ صرف ان کی جنگی کارکردگی کو سراہا جاتا تھا بلکہ اس کے کردار، اس کی نسلی پس منظر اور دیگر کارگزاریوں پر بھی روشنی ڈالی جاتی ۔ان منظوم داستانوں میں میدان جنگ میں ہونے والی لڑائی کی بہترین نقشہ کشی کی جاتی تھی ۔یہ اشعار سن کر لگتا ہے کہ میر کمبر نگاہوں کے سامنے دشمن پر لپک لپک کر وار کر رہا ہے ۔بلوچ پہلوانوں کی منظوم

داستانوں نے کئی بلوچ ہیروؤں کو گمنام ہونے سے بچالیا ہے ان میں میر کمبر کی عسکری زندگی کے کئی واقعات بھی شامل ہیں۔ جو نیست و نابود ہونے سے بچ گئے ہیں لیکن پھر بھی اس کی مکمل شخصیت اور اس کے بے مثال دلیرانہ کارنامے اور بیسویں فتوحات کی تفاصیل ہم تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔ جو کچھ میسر ہے وہ قلیل اور بے ربط ہے اس کے جانشین اور اسکی نسل کے چیدہ چیدہ نامور شخصیتوں نے بھی اپنے مجاہد جد امجد کے بے مثال کارناموں کو ضبط تحریر میں لانے کی سعی نہیں کی۔ حالانکہ ان کا سابقہ علماء اور فضلا اور قلم والوں سے یقیناً تھا۔ ان میں سے اکثر صرف حکم دے کر وہ سب کچھ محفوظ کرا سکتے تھے جواب قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ لیکن تاریخ جیسی اہم چیز کی اہمیت سے وہ بے خبر اور غافل رہے۔ اپنے طور پر مورخین اور محققین نے میر کمبر رئیس کے تاریخی کردار اُس کے عظیم مقام و مرتبے کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے۔ جو انہوں نے مجموعی طور پر بلوچ اور بلوچستان کی تاریخ کے ساتھ کیا ہے۔

معلوم تاریخ میں میر کمبر وہ پہلا ہیرو ہے جس نے بلوچستان میں پہلی بار ایک باقائدہ اور منظّم حکومت کی بنیاد رکھدی اور جس سے قلات میں بلوچوں کے خوانین کا سلسلہ چل نکلا۔ میر کمبر سے قبل وسطی بلوچستان میں

سرداروں کی چھوٹی چھوٹی قبائلی ریاستیں تھیں جن میں جنگل کا قانون کارفرما تھا اور جہاں قوانین اور ضابطے جیسی کسی شئے کا وجود نہیں تھا۔ قبائل معمولی معمولی جھگڑوں پر آپس میں کشت وخون کرتے رہتے تھے۔ اور یہ سلسلہ بجائے کم یا ختم ہونے کے طویل ہوتا جاتا تھا۔

میر کبیر رئیس وہ پہلا شخص تھا جس نے کمال ہشیاری سے ان قبائل کو متحد کیا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی سرداریوں کا قلع قمع کیا اور انہیں اپنے ساتھ لگا کر قلات میں ایک منظم بلوچی حکومت کا آغاز کیا۔ وہ قلات کی فتح سے قبل دو خطوں کا ایک پُر وقار حاکم تھا۔ ایک خطہ ''سرحد'' اور دوسرا ''پنجگور تا حد کیچ'' تھا۔ جو اُس کے اقتدار اعلیٰ میں شامل تھے۔ ''سرحد'' ایک وسیع خطے کا نام ہے۔ قدیم سرحد، موجودہ تفتان کے شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ ایران کے اندرونی بلوچ علاقوں پر مشتمل تھا اور جغرافیائی طور پر ملک سیستان میں واقع تھا۔ جی۔ پی۔ ٹیٹ نے اپنی تصنیف ''سیستان'' میں لکھا ہے کہ کرمان کے مشرقی اضلاع ''سرحد'' کہلاتے ہیں۔

میر کبیر جیسا تاریخی ہیرو جس کا نام پندرھویں سولھویں صدی عیسوی سے لے کر موجودہ زمانے تک سرحدی اور پہاڑی بلوچوں میں عظمتوں کی پہچان چلا آرہا ہے دنیا کی نظروں سے اوجھل رہا ہے اور دنیا

اُس کے کارناموں سے بے خبر رہی ہے۔ وہ موروثی طور پر کوئی شہزادہ نہیں تھا بلکہ اس کا گھرانہ اللہ والوں اور فقیروں کا گھرانہ مشہور رہا ہے۔ میر کمبر کا والد عالم جوانی سے قدرتی طور پر جذب وکیف سے سرشار تھا۔ کمبر کی جوانی کے ایام میں وہ ایک پہنچا ہوا بزرگ مانا جاتا تھا۔

میر کمبر رئیس کو ابتدا سے شمشیر زنی اور رزم آرائیوں کا ماحول کبھی نہیں ملا۔ لیکن پھر بھی واقعات وحالات نے اُسے اُس نہج پر ڈال دیا جہاں پر قدرت نے اس سے شمشیر زنی اور حکمرانی کا کام لیا۔ اور وہ تھوڑے سے عرصہ میں پنجگور کا ایک جری حاکم بن بیٹھا۔ اور شمشیر زنوں کی ایک فوج ظفر موج اس کے گرد جمع ہوگئی۔ جو اس کے دست وبازو اور جان نثار بن گئے ۔ اور دو سال کے قلیل عرصہ میں وہ ایرانی سرداروں کے زیر اثر علاقہ ''سرحد'' پر قابض ہوگیا۔ اور اس کی تلوار بازی اور بہادری کے کارناموں کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی تھی۔

سرحد پر قبضہ، ایرانیوں کو بہت گراں گذرا۔ انہوں نے میر کمبر کو سبق سکھانے کے لئے ایک لشکر جرار شاہ پور نامی سپہ سالار کی سرکردگی میں پنجگور پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ جس نے کوہ بن کے مقام پر پڑاؤ ڈالا ۔ وہاں کے ایک مقامی سردار ''نوہاں'' نے اپنے قبائل کے ساتھ ہنگامی طور

پر اس کا مقابلہ کیا۔ان دنوں میر کمبر علاقہ گچک میں مقیم تھے جنہیں ایرانی لشکر کے پنجگور پر حملے کی اطلاع دی گئی۔میر کمبر نے ہنگامی طور پر تیاری کی اور اپنے جاں نثاروں کے ساتھ نوبان کی مدد کو پہنچے۔اور شدید لڑائی میں میر کمبر نے شاہ پور کو قتل کر دیا اور اس کا سر نیزے پر گاڑھ کر میدان میں لہراتے رہے۔جس سے گجر (قاچار کی بلوچی ادائیگی) شکست کھا کر ایران کی طرف بھاگ گیا۔اس جنگ میں میر کمبر کو کافی اسلحہ، گھوڑے اور دیگر مال غنیمت ہاتھ لگا۔

جب میر کمبر کو بتایا گیا کہ تسپ گاؤں کے قبیلہ کوٹی کے ایک معمولی سردار نے شاہ پور کے لشکر کے ساتھ ساز باز کی تھی تو انہوں نے کوٹی قلعہ پر حملہ کیا اور اس غدار کو تہہ تیغ کر کے قلعے پر اپنے ایک عزیز زنگی رئیس کو قلعہ دار مقرر کیا۔چند عرصہ بعد میر کمبر نے پنجگور پر اپنی عملداری قائم کر دی تھی۔انہوں نے مغربی بلوچستان کے علاقہ سراوان کے چار قلعوں پر حملہ کر کے ایرانیوں کی بالادستی ختم کر دی اور انہیں اپنے زیر نگیں لے آیا۔قدیم بلوچی شاعری میر کمبر کی فتوحات کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔

میر کمبر رئیس کے اقتدار کا زمانہ ٹھیک طرح سے سنین کے مطابق نامعلوم ہے۔البتہ بلوچی شاعری سے ہمیں پتہ چلتا ہے۔

بُرزا اعظم خان انت جہلاتا کیچ کمبر انت

ڈھاڈر ءَ میران ماں تلی سندھ ءَ عومر انت

بیلو ءَ عالی ہوت ہیوی ءَ چاکر انت

ترجمہ؛ ''(مکران کے) بالائی علاقوں میں اعظم خان اور زیریں علاقوں تا سرحد کیچ میر کمبر کا اقتدار تھا۔ ڈھاڈر (کچھی) میں میران (رند) اور تلی سندھ (موجودہ نصیر آباد) میں میر عومر (نوہانی) حاکم تھے جبکہ بیلہ میں عالی ہوت (مشہور بہ عاری جام) اور سبی میں چاکر (رند) کے اقتدار کا دبدبہ تھا۔''

اس طرح بلوچی شاعری کے توسط سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ میر کمبر سولہویں صدی عیسوی کی شروعات میں پنجگور اور علاقہ سرحد میں برسر اقتدار تھا۔ گچک وادی اس کا مضبوط دارالحکومت تھا۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی سرداریوں کو پنپنے کا موقعہ نہیں دیا اور سرداروں کو عزت واحترام سے اپنا ہمنوا کیا۔ علاقے میں ایرانیوں کی بدمعاشی اور چوری وڈاکہ زنی کا خاتمہ کیا۔ اور جب تک میر کمبر کا اقتدار تھا ایرانیوں کو پنجگور وگردونواح کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میر کمبر رئیس کی بہادری کی دھاک بلوچستان کے چپہ چپہ پر اس حد تک بیٹھ گئی تھی کہ قلات سیوا کے حاکموں پر جب سندھی ڈاکوؤں، بُلفت

اور مزاری بلوچ باغیوں کی وجہ سے عرصہ حیات تنگ ہوا تو انہوں نے اپنی مدد کے لئے اپنے آس پاس نظر دوڑائی۔لیکن کوئی ایسی طاقت انہیں نظر نہ آئی جوان باغیوں سے بھر پور قوت سے نمٹ لیتا اور ان کا قلع قمع کرلیتا۔صرف ایک میر کمبر رئیس ایسی شخصیت تھے جو قلات سیوا کے حاکموں کی نظر میں اُن کے اقتدار کو ان طاقتور باغیوں سے بچا سکتا تھا۔چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ قلات سیوا کے حاکموں کو آخر کار میر کمبر ہی کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔اس تاریخی واقعے کو پہلی دفعہ مختصر طور پر انگریز محقق ہنری پوٹنگر نے اپنی کتاب ''سفرنامہ سندھ وبلوچستان''میں بیان کیا۔وہ لکھتے ہیں۔

''قلات پر صدیوں سے ایک ہندو خاندان حکومت کرتا تھا۔اور آخری راجہ کا نام سیوا تھا۔یا اس خاندان کے حکمران گدی نشین ہونے کے بعد یہی لقب اختیار کرتے تھے۔موخرالذکر زیادہ قرین قیاس ہے اس لئے کہ قلات اب بھی اکثر قلات سیوا کہلاتا ہے۔جس کی اغلب وجہ فرد کی بجائے حکمرانوں کا ایک سلسلہ ہے۔الّا یہ کہ کوئی فرد نصیر خان کی طرح عظیم اوصاف اور صفات کا حامل یا ان کی وجہ سے ممتاز رہا ہو۔

سیوا خود زیادہ تر قلات میں رہتا تھا اور اس کا اکلوتا بیٹا سنگین بطور

نائب زہری میں قیام پذیر تھا۔ان دونوں کی حکومت عادلانہ تھی اور وہ اپنی مملکت میں سوداگروں اور دیگر نو واردوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ملتان ،شکار پور اور بالائی سندھ کے مغربی حصوں کے قزاقوں کا ایک گروہ ایک افغان سرغنہ کے تحت اور ایک رند بلوچ قبیلہ مزاری (جواب بھی تاخت وتاراج کے لئے مشہور ہے) کی حمایت کے ساتھ سارے علاقہ پر بار بار یورشیں کرتا رہتا تھا۔اب تو قلات بھی ان کے نرغے میں آ چکا تھا۔ (جوابھی ایک بے ترتیب سا گاؤں تھا)لہذا سیوا کو مجبوراً پہاڑی چرواہوں اوران کے سردار کو مدد کے لئے بلانا پڑا(6)یہ سردار کمبر تھا۔اس کے آباو اجداد اصل میں حبشی بتائے جاتے ہیں(7)اور وہ خود ایک مشہور پیر کی اولاد سمجھا جاتا تھا جس نے اپنے دور میں بہت سی کرامات دکھائی تھیں ۔اس سے کمبر اور اس کے حامیوں کو ملک میں ایک خاص وقار اور افتخار حاصل ہو گیا۔جو حامیوں کی مختصر تعداد اور کمبر کی حقیر موروثی جائیداد جو پنجگور مکران میں تھی ، کے بل بوتے پر حاصل کرنا ناممکن تھا۔جھالاوان اور سراوان کے پہاڑوں پر پہلی دفعہ چڑھنے کے بعد سیوا نے اپنے ان مددگاروں کو حقیر سا وظیفہ دیا جو بمشکل ان کی گذر اوقات کے لئے کافی ہوتا تھا۔لیکن چند سالوں میں ڈاکوؤں کی سرکوبی یا ان کا قلع قمع کر کے یہ لوگ ملک کا فوجی

قبیلہ بن بیٹھے۔ کمبر نے راجہ کو تخت سے اتار دیا اور سربراہ مملکت بن کر ہندوؤں کو مسلمان بننے پر مجبور کر دیا یا مذہبی جذبے کے تحت موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سیوا چند لوگوں کے ساتھ زہری چلا گیا جہاں اس کا بیٹا سنگین (8) ابھی برسر اقتدار تھا۔ لیکن ان کے دشمن دیگر قبائل کو حلیف بنا بنا کر یوماً فیوماً'' زور پکڑتے گئے اور بالآخر انہیں اس پناہ گاہ سے بھی نکال دیا گیا۔ اور وہ شکار پور، بھکر اور ملتان چلے گئے اور اپنے ہم مذہبوں میں جذب ہو گئے۔

بتایا جاتا ہے کہ سیوا اس بغاوت کے آخر میں مر گیا اور سنگین نے قید ہو کر اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بہت سے پیروکار بھی مسلمان ہو گئے۔''

قلات پر میر کمبر رئیس کے قبضہ کے واقعہ کو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق جب افغان ڈاکوؤں نے قلات کے ہندو حکمرانوں (9) کو تنگ کرنا شروع کیا اور مذکورہ حاکم آئے دن ان کے حملوں سے تنگ آ گئے تو انہوں نے کمبر اور اُس کے خانہ بدوش گڈریوں کو مدد کے لیے بلایا۔ کمبر نے راجہ کی مدد کی اور آخر کار خود راجہ کو ملک بدر کر دیا اور حکومت پر قبضہ کر لیا (10)۔

نیلسن انسائیکلو پیڈیا جلد سوئم میں قلات پر میر کمبر کی بالادستی کے واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

''میر کمبر نے راجہ کو شکست دے کر قلات میں بروہی خوانین (11) کی بنیاد رکھی، اس دن سے پہلے قلات کو قلات سیوا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔اس دن کے بعد ''قلات بلوچ'' پکارا جانے لگا۔''

اس طرح میر کمبر رئیس نے اپنے جنگجو بلوچ لشکر کے ساتھ قلات وزہری پر قبضہ کر کے ایک باقاعدہ بلوچی حکومت کی بنیاد ڈالی اور وسطی بلوچستان میں رئیس خوانین کا سکہ بٹھادیا۔

میر کمبر رئیس وہ واحد بلوچ ہیرو ہیں جسے قدیم بلوچی شاعری میں میر چاکر رند کے بعد سب سے زیادہ خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔اور اس کا مقام میر چاکر سے ارفع واعلیٰ بیان کیا گیا ہے۔میر چاکر رند بلوچ قبائل میں ایک متنازعہ شخصیت کے مالک تھے جس میں میر کمبر رئیس کے برعکس خود پسندی اور خودغرضی کے جذبات زیادہ پائے جاتے تھے۔وہ قومی سے زیادہ ایک قبائلی سردار تھا جو صرف رندیت سے مغلوب تھا۔لیکن میر کمبر ایک قومی سوچ رکھنے والا معتدل مزاج شخص تھا۔اُس نے کبھی کسی ذاتی یا قبائلی مفاد کے لئے لڑائی مول نہیں لی۔بلکہ ہمیشہ مظلوم کے حق میں اور جارح کے

خلاف لڑتا تھا۔اور بلوچ کاز کے لئے لڑتا تھا۔قبائلی رنجشیں اور دیرینہ دشمنیوں کوفرو کرنے میں وہ نہ اپنی جان کی پروا کرتا تھا اور نہ مال کی۔ان میں اپنے ہم عصر تمام سرداراور مشاہیر کی نسبت اسلام دوستی اور خداخوفی کا جذبہ زیادہ تھا۔یہ سب کچھ انہیں وراثت میں ملا تھا۔یہی وجہ ہے کہ قدیم شاعری میں کمبر کے لئے تعریفوں کے پُل باندھے گئے ہیں بلوچ، بہادروں کی تلوار کو کمبر کی تلوار سے تشبیہ دیتے رہے ہیں جنگوں کے مواقع پر شاعروں نے بلوچ سپاہیوں کو کمبر کی تلوار بن کر دشمن کو کاٹنے کی ترغیب دی ہے۔ بلوچ ماؤں نے اپنے بچوں کولوری دیتے وقت دعادی ہے کہ خدا انہیں اپنے زمانے کا کمبر بنائے۔

میر کمبر رئیس نے بلوچی تاریخ میں جو مقام پایا وہ اپنی بہادری، شمشیرزنی اوراپنے بزرگ باپ کی نیک تمناؤں اور دعاؤں کی وجہ سے پایا تھا۔وہ تلوار بازی میں یکتائے روزگار تھا۔جس کی پوری زندگی رزم آرائیوں اور جنگی مہمات سرکرنے میں گذری۔وہ آدھے بلوچستان کا فاتح اور مرکزی بلوچستان میں بلوچی حکومت کا بانی تھا۔جس پر بلوچستان اور خصوصاً پنجگور کی سرزمین جتنا فخر کرے کم ہے۔

اُس کا آبائی گاؤں پنجگور کا ''پروم'' بتایا جاتا ہے جہاں پر وہ پیدا

ہوئے۔ پروم کی آبادی کی اکثریت رئیس قبیلہ پر مشتمل ہے۔ عالم جوانی میں اُس کا اللہ والا باپ پنجگور ہی کے قدرے دور واقع گاؤں گچک منتقل ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنی بیشتر جائداد راہ خدا میں وقف کردی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر فقر و جذب کے عالم میں رہتے تھے۔ ان کا نام شاہ ملوک تھا۔ والد کی وفات کے بعد میر کمبر مستقل طور پر گچک میں رہائش پذیر ہوگئے۔ جہاں ان کے خاندان کا ایک قدیم قلعہ بھی تھا۔ جسے مرمت کر کے اپنے اور اپنی رضا کار فوج کے لئے رہنے کے قابل بنایا۔ یہ قلعہ تاریخ میں کمبر کلات (کمبر کا قلعہ) کے نام سے مشہور ہوگیا۔ (12)

میر کمبر رئیس اگر چہ کوئی تعلیم یافتہ شخص نہیں تھا لیکن ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے کی بنا پر قرانی تعلیم سے آراستہ تھا۔ ان کے بارے میں یہ روایت عام ہے کہ دوران سفر اور جنگی مہمات کے دوران وہ خود نماز پڑھاتا تھا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک نامی گرامی سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جاہل شخص نہیں تھا۔ شاید اسی اہلیت کی بنا پر وہ اپنے وقت کی اہم شخصیات سے ملاقاتیں کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ کئی مشاہیر سے میر کمبر کی ملاقاتوں کے قصے زبان زد عام ہیں۔ جن میں مارو الہز کے حاکم سلطان سعید، مشہور عالم دیؔن اور مہدی ہونے کے مدعی میران سید محمد

جونپوری، قلات نیچارہ کے حاکم میر مندو پھشر جسے سردار چاکر خان رند کا خُسر بتایا جاتا ہے، حاکم قندھار شاہ محمد قلاتی اور دیگر کئی شخصیات شامل تھے۔ قلاتِ نیچارہ پر حکومت کے دوران لاہور کے حاکم دولت خان لودھی، دلی کے بادشاہ ابراھیم لودھی سے باغی ہوکران کی حاکمی پناہ میں آ کر قتل ہونے سے بچ گئے تھے۔ واقعہ یوں ہے کہ عوام کی طرف سے دولت خان لودھی کے خلاف شکایات کی بھرمار تھی۔ جس سے بادشاہ ابراہیم خان لودھی سخت ناراض اور مشتعل تھا اور اُس نے دولت خان لودھی کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر مسلح بندے مقرر کئے۔ دولت خان لودھی قتل ہونے سے بچنے کے لئے بھاگ کر بلوچستان پہنچ گئے اور چند سفارشی لے کر میر کمبر کی پناہ میں آ گئے۔ جنہوں نے اس بھگوڑے کو شاہی مہمان رکھا۔ جب بابر بادشاہ نے قندھار فتح کیا اور پھر لاہور پر ہلہ بول دیا اور قتل و غارتگری کے بعد دیپال پور میں قیام کیا۔ تب دولت خان نے دیپال پور کا رُخ کیا اور بابر کا وفادار بن گیا۔

میر کمبر رئیس ایک بیباک اور نڈر سپہ سالار ہونے کے علاوہ ایک بہترین ڈپلومیٹ اور منصف اور وسیع القلب حکمران ثابت ہوئے۔ قلات میں برسر اقتدار آتے ہی انہوں نے قبائل میں جاری خونریزیوں کے خاتمے

کے لئے جگہ جگہ قانون کی عملدری قائم کی اور قبائلی جرگوں کا انعقاد کیا اور قبائل کے مابین چلنے والی دشمنیوں کے منصفانہ فیصلے کئے اور سرداروں کے درمیان دوستانہ روابط کو فروغ دیا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ حکمران خاندان میں دیر تک اقتدار کے مسئلہ پر اتفاق اور مفاہمت نہیں رہتی اور باپ بیٹوں اور بھائیوں میں قتل و غارتگری پروان چڑھتے ہیں۔ دشمن مقتدر خاندان ہی کی سرکردہ شخصیتوں کے ذریعہ سازشوں کا جال پھیلاتے ہیں۔ بلوچستان کے ہمسایہ ممالک کی تاریخ نہ صرف یہی دکھاتی ہے بلکہ خود میر کمبر کے بعد خوانین بلوچ کے خانوادوں میں بھی شیرازی ملاؤں کی شرارتوں سے یہی کچھ ہوتا رہا۔ جس کی پوری تاریخ موجود ہے۔ لیکن کتنی بڑی بات ہے کہ جب تک میر کمبر رئیس مختلف خطوں میں حکمران رہے کسی بھی جگہ اندرونی سازشوں کو پنپنے کا موقعہ نہیں ملا اور ان کا اپنا خاندان اور قبیلہ رئیس کسی بھی مرحلہ پر اقتدار کے لالچ میں نہیں پڑا۔ اور کہیں بھی اپنوں میں کشت وخون کا بازار گرم نہیں رہا۔ جو کچھ ہوا تھا یا کرایا گیا تھا جانے پہچانے اور معلوم دشمنوں کی طرف سے ہوتا رہا۔ جس کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے بلکہ یہ بھی تاریخ کے صفحات پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے کمال وسیع القلبی سے دشمن پر مہربانیاں کیں اور ان کو علاقے بھی بخش دیئے۔ اس سلسلے میں

معروف سندھی تاریخ ''جنت السندھ'' (سندھی) کے مئولف جناب رحیم داد خان مولائی شیدائی لکھتے ہیں۔

''قلات کا قدیم نام ''قلات سیوا'' تھا جہاں پر سیوا خاندان کے راجا حکومت کرتے تھے۔ اسی خاندان کے ایک راجہ سیھرس سے میر کمبر نے قلات فتح کیا اور پھر اس کا نام قلات بلوچ رکھ دیا۔ سیھرس کے بیٹے سنجن نے خوشی سے اسلام قبول کیا۔ جسے میر کمبر نے جھلاوان کی ریاست مرحمت کی'' (346)

جیسے کہ اوپر ہم نے لکھا ہے کہ میر کمبر رئیس نے قلات وگردونواح پر بالادستی محکم کرنے کے بعد منتشر قبائل کی شیرازہ بندی کے کام کی طرف توجہ مبذول کیا اور جرگے منعقد کر کے نظام کے بارے میں صلاح ومشورہ کئے تا کہ ایک بہتر نظام حکومت جو بلوچ سماج کی نفسیات کے مطابق ہو تشکیل دی جاسکے۔ اس بارے میں۔ انگریز محقق چارلس میسن نے اپنی کتاب ''سفر نامہ قلات'' میں لکھا ہے کہ۔

''نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نیا نظام حکومت قائم کیا گیا۔ جو اس وسیع سلطنت کے مطابق تھا۔ اس کے تحت اختیار اعلیٰ کمبر کے سپرد کیا گیا اور اسے موروثی بنایا گیا۔ رئیسانی اور زہری قبائل (13) کے سرداروں کو اعلیٰ الترتیب سراوان

اور جہلاوان کے سر سرداران بنا گیا۔اور انہیں بھی مورثی بنایا گیا۔مزید برآں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ دربار کے مواقع پر سردار سراوان، خان کے دائیں طرف اور سردار جہلاوان خان کے بائیں جانب بیٹھے گا۔مفاد عامہ کی فلاح و بہبود کے امور پہلی شنوائی کے لئے سردار سراوان کے سامنے پیش ہوتے جس کا حق رائے دہی فائق قرار دیا گیا۔اس کے بعد سردار جہلاوان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ان دونوں سرداروں کی منشا کے بغیر کوئی اہم قدم نہ اُٹھایا جاتا۔جو قبائل پر اپنے اثر ورسوخ کی بدولت ایسی حمایت روک بھی سکتے تھے لہذا خان پر یہ لازم ہوگیا کہ وہ اپنے ان موروثی مشیروں کے مطابق چلے۔ورنہ وہ فوراً بے دست و پا ہو جاتا۔اس نظام کی وجہ خان اور اُس کے قبائل کے درمیان اتفاق واشتراک ہو یا اس مطلق العنانی سے روکنے کی خواہش وکوشش ہو۔بہر حال اس نے خان کو سرداروں کی من موج کا دست نگر بنا دیا جو اکثر و بیشتر اطمینان ناپذیر اور مخالف ہوتے تھے۔اس کے علاوہ خان کا ایک خصوصی مشیر بھی ہوتا تھا جو موروثی بنا دیا گیا تھا۔یہ دہوار یا تاجیک آبادی سے چُنا جاتا تھا۔تاکہ یہ حصہ آبادی مطمئن رہ سکے ۔جو کہ سلطنت کی آمدنی کا ضامن تھا۔(14)

میر کبیر رئیس نے نظام حکومت کو قبائلی جمہوری طریقہ سے چلانے

کی ابتدا اس طرح کی کہ سب سے پہلے مملکت کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ قلات کی مرکزیت کو ایک حصہ بنا کر بالائی علاقوں کو الگ کر کے ایک انتظامی یونٹ بنایا۔اور زیرین علاقوں کو الگ کر کے دوسرا یونٹ بنایا جو بلوچی میں سراوان اور جھلاوان کہلائے۔

جھلاوان و سراوان کے معاملات اندرونی طور پر قبائلی سرداروں کے ذریعے نمٹانے کے لئے ان کی صوابدید پر چھوڑ دیئے گئے۔قلات کی مرکزیت کے معاملات بلوچی دربار سے منتخب کردہ ایک سات رکنی کمیٹی کے سپرد کئے گئے۔جس کا سربراہ رئیس سردار ہوتا تھا۔ ارکان میں دہوار، کرد، نیچاری ،سیوازئی ہندو، شیرازی آخوند اُور پھور رند (مندوانی) ہوتے تھے۔تینوں انتظامی یونٹوں پر سپریم اتھارٹی خان ہوتا تھا۔ جو تمام فیصلوں کو رد کرنے یا انہیں منظور کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔لیکن میر کمبر ایسے تمام فیصلے سرسرداران جھلاوان ،سرسرداران سراوان ،رئیس سردار اور دہوار معتبرین سے مشوروں کے بعد کیا کرتے تھے۔اور یہ یقیناً باہمی اشتراک عمل اور جمہوری طور پر مشاورت کا نتیجہ تھا کہ اس کے دور حکومت میں اندرونی اختلافات اُبھر نہ سکے اور انہوں نے بیرونی حملہ آوروں اور دشمنوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور قوم کو فتح سے ہمکنار کیا۔

میر کمبر نے پہلی دفعہ بلوچ فوج کی تنظیم پر توجہ دی۔ پیادے اور سوار دستے تشکیل دیئے۔ باقاعدہ اور بے قاعدہ افواج میں نئے نئے عہدے مقرر کئے۔ اور ان کے لئے قبائلی رواج کے مطابق قوائد و شرائط وضع کئے۔ ان کے ادارے اور محکمے بنائے۔ جوانوں کی بھرتی کا طریقہ وضع کیا۔ انہوں نے ہر قبیلہ کی ذمہ داری لگا دی کہ ہنگامی حالات میں وہ ایک مقررہ تعداد میں لشکر مہیا کرے گا۔ اور اس کا ذمہ دار متعلقہ قبیلہ کا سردار ہوتا تھا۔ جو بوقت ضرورت ٹکریوں سے دو دن کے اندر اندر مطلوبہ لشکر حاصل کرتا تھا۔ اور خان کو اس کی اطلاع دیتا تھا۔ سرداروں کے ذمہ یہ بھی لگا دیا گیا تھا کہ جنگی اخراجات کے تخمینے کا تین چوتھائی حصہ وہ مہیا کریں گے اور خان ایک چوتھائی حصے کا بندوبست اپنے سے کرے گا۔

میر کمبر رئیس کے اقتدار میں آنے سے قبل مرکزیت میں مجرموں کے لئے کوئی قید خانہ نہیں تھا۔ صرف سرداروں کے ذاتی جیل خانے ہوتے تھے۔ جہاں پر مخالفین کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ انہوں نے ایک جیل خانہ بنوایا اور اس میں اصلاحات کیں۔ مرکزیت کے قرب وجوار میں سرداروں کی ذاتی جیلیں بند کروادیں۔ اور مزید جیل بنانے پر پابندی لگا دی۔

اُن دنوں مختلف تجارتی قافلوں پر سرداروں کے علاقہ میں کئی ٹیکسوں کی وصولی ہوتی تھی اور تجارتی قافلے تجارتی راستوں پر آزادانہ تجارت بھی نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ راستے محفوظ نہیں تھے۔ بعض اوقات ٹیکس وصولنے کے باوجود اسی سردار کے علاقے میں قافلہ لٹ جاتا تھا جہاں سے بخیر وعافیت قافلہ کو گذارنا اُسی کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ میر کمبر نے نہ صرف راستوں کا تحفظ یقینی بنایا بلکہ ٹیکسوں میں بھی رعایتیں دیں اور اصلاحات کیں۔ اب سردار اپنی مرضی سے ٹیکس وصول نہیں کر سکتا تھا بلکہ اسے ٹیکس وصولی کا ایک مختیار نامہ مرکز کی جانب سے جاری کیا جاتا تھا جس میں ٹیکس کی شرحیں درج ہوتی تھیں۔ یہ ٹیکس بلوچی میں سُنگ کہلاتے تھے۔ انہوں نے غلہ، جوار، باجرہ، چاول، بھوسہ، چارہ کھجور وغیرہ پر عائد سُنگ ختم کئے۔ انہوں نے اپنے دائرہ اقتدار میں بھنگ اور افیون کی کاشت اور تجارت کو ممنوع قرار دیا تھا۔ شراب کشید کرنے پر پابندی تھی۔ ان دنوں بُتوں اور مورتیوں کی بھی تیاری اور تجارت کافی ہوتی تھی۔ بُت سازی کے دو مشہور مرکز ''گنداوہ اور گریشہ'' ہوتے تھے جہاں پر مٹی کی مورتیاں بناتے اور انہیں بھٹیوں میں سوختہ اور پکا کرنے کے بعد مختلف شہروں میں بغرض تجارت لیجانے تھے۔ اس صنعت پر بھی پابندی لگائی گئی اور ایسے بھٹوں کی

تلاش کروا کر انہیں تباہ کر دیا گیا۔

میر کمبر نے زمینداری اور کاشتکاری کے فروغ کے لیے امداد باہمی اور حشر کے تحت مختلف شہروں میں کاریزیں کھدوائیں اور مقبوضہ اراضیات کو اپنے لوگوں سے کاشت کرایا۔ زمین آباد کرنے والے کاشتکار سے ایک حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ مختلف کاریزات کے علاقوں میں زمین، بیج اور محنت کے مقدار کا تعین کرنے کے بعد مختلف شرح سے حصہ مقرر کیا جاتا تھا ۔خان کی اپنی زمینوں کے آباد کار ''خان ءِ اُلس'' یعنی خان کی رعیت کہلاتے تھے۔

انہوں نے پہلی مرتبہ ہندوؤں پر ٹیکس کا نفاذ کیا اور انہیں مکمل تحفظ فراہم کیا۔ ہندوؤں کی نمائندگی کے لئے الگ شخص کا انتخاب کیا گیا۔ جس کا نام ''چندن'' تھا۔ جو گرمکھی زبان پڑھ اور لکھ سکتا تھا۔ روایت ہے کہ میر کمبر کی شہادت کے بعد قندہار کا ایک سکھ بیوپاری ''چندن'' کو خرید کر کے قندہار لے گیا ۔چندن کے مشورے پر ہندوؤں کی آبادی پر مسلح گارڈ تعینات کئے گئے ۔کیوں کہ تھوڑا عرصہ پہلے مزاری ڈاکوؤں نے ان کے محلّہ کو لُوٹ کر تاراج کیا تھا۔ اس کے بعد رات شروع ہوتے ہی کسی شخص کو شہر میں داخل ہونے نہیں دیا جاتا تھا۔ شہر سے باہر قافلوں اور مسافروں کے لئے مسافر خانے اور مہمان

خانے بنائے گئے تھے۔ صبح ہی باہر سے آنے والے شہر میں داخل ہو سکتے تھے۔

میر کبر رئیس کے زمانہ کے حکومت کے کئی دیگر واقعات غیر مربوط شکل میں روایت کی جاتی ہیں۔ چند ایک اہم واقعات کا تذکرہ ہم نے اپنی ایک کتاب ''کبران'' میں کیا ہے جنہیں یہاں پر مزید دہرایا نہیں جائیگا۔

میر کبر رئیس کے تین شجرہ ہائے نسب دستیاب ہیں۔ ایک شجرۂ نسب رائے بیتو رام نے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے جو اُن کے ایک جد امجد ''میر براہیم'' تک ہے۔ جو یقیناً نامکمل ہے۔ دوسرا شجرۂ نسب آخوند محمد صدیق نے اپنی کتاب ''اخبار الابرار'' میں درج کیا ہے جو اس طرح ہے۔

''میر کبر ولد میر ملوک ولد میر سنجر ولد میر حسن ولد میر گہرام ولد میر براہیم ولد زرک ولد زہر اولد میر کبر ولد سعد ولد عمر ولد حمزہ''

پنجگور کے پروم اور گچک کے رئیسوں کے توسط سے میر کبر کا روایتی شجرۂ نسب اس طرح دستیاب ہے۔

''میر کبر رئیس ولد شاہ ملوک عرف شاہو رئیس ولد میر حسن رئیس ولد میر گہرام رئیس ولد میر ابراہیم رئیس ولد سردار کبر رئیس ولد سردار زہرو رئیس (15) ولد میر سعد رئیس ولد سردار میر عومر رئیس ولد میر بور رئیس ولد میر حمزہ رئیس (16)

الغرض یہ عظیم سپوت جس کی پوری زندگی رزم آرائیوں میں گذری آدھے بلوچستان کا فاتح اور مرکزی بلوچستان میں بلوچی حکومت کا معلوم بانی تھا۔ جسے جدید بلوچستان کا بانی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بلوچی دنیا کا یہ ہیرو قبائلی ڈاکوؤں کے خلاف لشکر کشی کرتے ہوئے بیسیمہ کی پہاڑیوں میں دوران لڑائی شہید ہو گئے تھے۔ جنہیں قلات میں شہیدوں سے منسوب قبرستان میں زمین کے سپرد کیا گیا۔ اوران کی وصیت اور رئیس قبیلے کے رسم کے مطابق تین دنوں تک فاتحانہ جنگی طبل اور شادیانے بجائے گئے اور خیراتیں کی گئیں۔

اشاریہ:-

ا۔مکران،صدیوں تک ایک وسیع وعریض الگ سلطنت کے طور پر وجود رکھتا تھا۔ جو موجودہ بلوچستان کے تین چوتھائی علاقے کے برابر ہوتا تھا۔اس کے حدود اس طرح ہوتے تھے:-

اسکی مغربی سرحد موجودہ ایرانی بلوچستان کے ضلع بمپور تک تھی۔
جس کا بلوچی نام ''تَمبُو'' تھا۔بلوچ ساحل کے ساتھ ساتھ
موجودہ سونمیانی کا ''لکّ بِدوک'' اس کی دوسری سرحد تھی۔
خضدار کی سمت علاقہ فیروز آباد کے مغرب میں ''سمند'' کا
پہاڑی سلسلہ اس کی سرحد تھی جبکہ شمال کی جانب یہ کرمان اور
کوہ سیاہان تک اور جنوب کی طرف سمندر تک پھیلا ہوا تھا۔''

''اس کے سینے پر جہاں ایک وسیع وعریض بوتل نُما صحرا پھیلا ہوا ہے وہاں پر دشوار گذار پہاڑی سلسلے اور ایک دوسرے میں ملے ہوئے اور پیچیدہ پہاڑ اس زمین کی باگ تھامے ہوئے ہیں۔مرکزی جنوبی اور مشرقی کوہستانی سلسلے علاقہ مکران میں باہم آ ملتے ہیں۔مکران کی سرزمین رقبہ اور آبادی کی کمی کے باوجود ایک پُر اسرار علاقہ ہے۔فطرت نے جی کھول کر اس سرزمین کو نوازا ہے'' (سیستان و بلوچستان از ناصر عسکری۔اُردو ترجمہ

غوث بخش صابر)۔

مکران کے جنوبی علاقے سکندر اعظم کی فتوحات اور ایران کے داریوش کبیر کے عہد میں گڈروشیا (معرّب جَدروشیا) کہلاتے تھے۔ ''گڈروشیا'' کی وجہ تسمیہ ایک قدیم قبیلہ ''گڈرا'' کی نسبت سے تھا۔ جو انہی قریبی ساحلی راستوں کے آس پاس بود و باش رکھتا تھا جہاں سے سکندر کا بحری لشکر گذر رہا تھا۔ ''گڈرا'' قبیلہ شکل و شباہت میں افریقی معلوم ہوتا ہے ۔ان کی جسمانی ساخت اور عادات و فصائل انہی صفات کے حامل ہیں جو درواڑوں کے ضمن میں مورّخین نے بیان کئے ہیں۔ اور ان کی دراوڑ نسل ہونے کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

اس قدیم قبیلہ کے باقیات اب بھی لس بیلہ کے بیلہ اور اُتھل کے دیہاتوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ''گڈرا'' ہی کہلاتے ہیں۔ اس قبیلے کے بعض لوگ یا گروہ جو اُس زمانے میں جبکہ ''گڈروشیا'' کا نام ''مکران'' میں بدل چُکا تھا۔ مختلف وجوہات کی بنا پر ہجرت کر کے سندھ اور ہند کے اطراف میں چلے گئے، مکّران کی نسبت سے مکّرانی کہلائے اور ان کا قبیلائی نام ''گڈرا'' پس منظر میں چلا گیا یا انہوں نے جان بوجھ کر اس نام کو چھوڑ دیا جو صدیوں سے غلام اور کمین کا تصور لئے ہوئے تھا۔

مکران کی وجہ تسمیہ بھی مورخین و محققین کے لئے معمہ بنا رہا ہے اور وہ ایک کامیاب تحقیق کرنے کی بجائے اندازے اور مفروضے بیان کرتے آرہے ہیں۔ اور تاریخ نویس انہی مفروضوں کو دُھرا دُھرا کر مطمئن ہو رہا ہے۔ بعض نے لکھا کہ یہ پہلے ''مکایا'' کے نام سے مشہور تھا جو بتدریج ''مکران'' میں بدل گیا۔ حالانکہ نام اتنے واضح فرق کے ساتھ تبدیل نہیں ہو سکتے۔ مکایا اور مکران میں کافی فرق ہے۔ لہذا یہ ایک مفروضہ ہے۔ جسکی کوئی حقیقت نہیں ہے بعض کی رائے رہی ہے کہ یہ نام دراصل ''ماہی خوران'' رہا ہے جسے مقامی زبان نے ''مکران'' بنا دیا ہے۔ کچھ مصنفین نے اسے ''ماہِ کران'' لکھا اور کہا کہ یہ ''ماہ کران'' سے مکّران میں بدل گیا ہے ۔صاحب معجم البلدان کے مطابق ''مکران'' کا نام ''مکران بن فارک بن سام بن نوح کے نام پر ہے۔ جس کا ایک بھائی کرمان تھا۔ جس کے نام پر ''کرمان'' ہے۔ یہ انہی بھائیوں کے مساکن تھے۔ اس لئے اُن کے نام سے مشہور ہو گئے۔ لیکن یہ بھی ایک مفروضہ ہے۔ حضرت نوح کی اولاد کے حقیقی نام متفقہ طور پر ثابت ہی نہیں ہیں پھر یہ کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ مکران اور کرمان، ان کے بیٹوں کے نام تھے۔ درحقیقت لفظ ''مکّران (MUKKURAN)'' ''مکّر'' کی جمع ہے۔ اور ایسے ہی ''کرمان'' کرما

'' کی جمع ہے۔ ''مکز'' اور ''کرِما'' یا ''کرمہ'' دو قدیم قبیلے تھے۔ جو ان خطوں کے باشندے تھے۔ مکر، تُرک قبیلہ تھا۔ جس کے متعدد طائفوں میں سے دو نامور طائفے ''دیول'' اور ''بھرت'' تھے۔ جن کے نام کے مواضع مکران میں موجود ہیں۔ یہ قبیلے یا طائفے مزید ہندوستان کی طرف ہجرت کر گئے۔ سندھ کا تاریخی بندرگاہ ''دیبل'' اسی تُرک قبیلہ کا مسکن تھا۔ یہ قبیلہ اب بھی ہندوستان میں اپنے قدیم نام ''دیول'' سے موجود ہے۔ مکران میں دیول کے قدیم آثار دشت کے موضع کُنڑی کے شمال میں اسی نام سے موجود ہیں۔ ''بھرت'' تُرک، تُمپ (ضلع کیچ) میں آباد تھے۔ ان کے نام کا موضع اب بھی موجود ہے۔ ان تُرکوں نے ہندوستان میں ''بھرت پور'' آباد کیا۔ یہ قبیلہ بھی انڈیا میں موجود ہے۔ قبیلہ ''مکز بھی صدیوں سے موجود ہے۔ پاکستان میں پنجاب اور کشمیر کے گُجروں میں یہ قبیلہ پایا جاتا ہے۔ مکزان کے اکثر قدیم مواضع، ندی نالوں، پہاڑوں اور قلعوں کے نام قدیم تُرک اور بلوچ طائفوں کے ناموں پر ہیں۔ جو اس چیز کا ثبوت ہیں کہ مذکورہ قبیلے کسی دور میں یہاں اپنی پوری قبائلی طاقت کے ساتھ آباد تھے۔ زمانے کے حوادث نے انہیں مشرق، مغرب اور شمال کے اطراف میں ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا۔

مکرّ'' قبیلہ پتھر کے قلعوں کی تعمیر اور خوبصورت کشیدہ کاری اور قالین بافی میں شہرت رکھتا تھا۔ ان کے منقّش قالین مکران سے ترکی، عراق اور عرب ممالک کو برآمد ہوتی تھیں جہاں ان کی بہت مانگ ہوتی تھی۔ یہ خوبصورت قالین ''مکرّ'' قالین بافوں کی نسبت سے ''مکّری'' کے نام سے مشہور تھیں۔ بادشاہان وقت اپنے محلّوں کے لئے خصوصی طور پر یہ منگواتی تھیں۔ مکّران (مکرّ لوگ) جو زبان بولتے تھے اُس کا نام ان لوگوں کی نسبت سے مکّرانی تھا جو آج بھی ہے جسے بعض اہل قلم اپنی تحریروں میں مغربی بلوچی لکھتے ہیں۔ چونکہ مکران اور دیگر تُرک قبیلے جو اس خطّے کے باسی تھے اور یہیں رہ کر بلوچ اکثریت میں مدغم ہو گئے۔ اور مکّرانی زبان بلوچوں کی بھی زبان بن گئی اس واسطے اس کا نام بتدریج مکّرانی سے بلوچی میں بدل رہا ہے جسے اہل قلم مغربی بلوچی کا نام دیتے ہیں۔ جو بلوچی مشرقی بلوچستان اور پنجاب میں بولی جاتی ہے اُس کا قدیم نام ''گُردی'' رہا ہے جسے مغربی ایران کے گُرد بولتے تھے۔ ایران کے جناب ناصر عسکری نے اپنی فارسی تصنیف ''سیستان و بلوچستان'' میں لکھا ہے کہ بلوچی زبان کی زاد بُوم اور اصل علاقہ مغربی ایران ہے جو بعد ازاں مشرق اور بلوچستان میں پھیلی ہے۔ (یہاں بلوچستان سے مراد ایرانی بلوچستان ہے)۔

۲۔ سیستان، زمانہ قدیم سے کئی بلوچ قبائل کا تاریخی وطن رہا ہے جس کے سینکڑوں قدیم آثار آج بھی بلوچی قومی شناخت اور بلوچی تہذیب وثقافت کے نا قابل تردید ثبوت کا درجہ رکھتے ہیں۔ آج بھی بلوچ قبائل سیستان سے اسی قدر محبت اور لگاؤ رکھتے ہیں جس قدر وہ صدیوں پہلے رکھتے تھے۔ جنوبی سیستان آج بھی بلوچ قبائل سے معمور ہے۔ بلوچی کا یہ مصرع آج بھی بلوچوں کی زبان پر رواں دواں ہے جو سیستان سے ان کی دلی لگاؤ کا مظہر ہے۔

مادی پہ سیستان ءَ جناں شئیر اں

یعنی

ہم بھی سیستان کے گیت گاتے ہیں۔

سیستان میں بلوچ تہذیب وتمدن اتنا پھلا پھولا اور اس کے نقوش اتنے اُبھرے اور پھیلے کہ اس نے سینکڑوں غیر بلوچ قبائل کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس سرزمین نے بلوچ کوڈ آف آنر کو اس حد تک شناخت دے دی کہ اس کا نام ہی ''بلوچی سیستان'' پڑ گیا۔

زمانہ قدیم میں سیستان کے حدود نہایت وسیع ہوتے تھے۔ سولہویں صدی عیسوی کے اواخر تک موجودہ بلوچستان کے اکثر حصے سیستان کے شاملات

ہوتے تھے۔اس قدیم تاریخی سرزمین پر تاریخی بلوچ شخصیات کی دلاوری اور سرفروشی کی متعدد داستانیں بکھری پڑی ہیں جو قلم بکف مجاہدوں کی راہ تک رہی ہیں۔

سیستان کا مرکزی مقام مختلف ادوار میں حالات کے پیش نظر بدلتا رہا ہے۔اس کا قدیم ترین نام اور مقام زرنج رہا ہے جو کہ زرنگ اور زرنگہ بھی کہلاتا رہا ہے جو ایرانی تاریخ کے مطابق گیارہ سو سال قبل سیستان کا دارالحکومت تھا۔جس کے قرب و جوار کا خطہ تاریخی اور تمدنی لحاظ سے عظیم ترین شمار کیا گیا ہے۔ایران کی قدیم ترین تہذیب وتمدّن کی جنم بھومی یہی خطّہ ہے۔آریاؤں کا مادر وطن بھی یہی ہے جہاں سے یہ مختلف اطراف میں پھیلے۔ایران وفارس اور اطراف کے زیادہ تر بادشاہ اسی سرزمین کی خاک میں مدفون ہیں۔روئے زمین کے ابتدائی طرز تعمیر کے قدیم ترین مینار یں اور قلعے یہیں تعمیر ہوکر معدوم ہوئے۔بڑے پہلوان اور شاعر اور قبائلی جنگجو اسی سرزمین نے پیدا کئے۔فارسی زبان کے اوّلین شاعر اسی خطے میں پیدا ہوکر نامدار ہوئے۔دین زرتشت کی سب سے زیادہ نشوونما یہیں پر ہوئی اور یہیں سے بحر بلوچ تک پھیل گیا۔۱۳۰ قبل مسیح میں ساکا قبائل وسطی ایشیا سے طوفان کی طرح اُٹھے اور ایران کے وسیع علاقے میں پھیل گئے۔انہوں

نے کرکوک کو اپنا مرکز بنایا اور آس پاس تباہی مچاتے رہے۔ انہوں نے سیستان کو دل کھول کر لتاڑا اور گروہ در گروہ آگے بڑھتے رہے۔ ساکاؤں نے سب سے زیادہ نقصان زرنج یا زرنگہ کو پہنچایا۔ اور وہاں موجود عظیم تاریخی آثار کو تہس نہس کر دیا اور شاہوں اور نامور شخصیوں کے عظیم الشان گنبدوں میں اپنے سردار اور جنگجوؤں کو دفن کر کے انہیں اپنے ناموں سے منسوب کیا۔ اس طریقے سے ساکاؤں نے زرنج اور قرب وجوار کے قدیم تاریخی اور تہذیبی آثار مٹا دیئے۔ زرنج کے کھنڈرات، نادعلی کے نزدیک پھیلے ہوئے بتائے جاتے ہیں۔

سیستان کی وجہ تسمیہ کو مورخین نے ساکاؤں سے نسبت دیتے ہوئے اسے ساکستان یا ساکستان کی بگاڑ تحریر کیا ہے جو کہ سو فیصد غلط اور ایک مفروضہ موقف ہے۔ بعض نے اسے سیوستان کی تبدیل شدہ شکل بتایا ہے۔ یہ سب دیگر سینکڑوں مفروضات کی طرح ایک مفروضہ ہے۔ مواضع اور ممالک کے اسماء کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ناکام مورخین و محققین کا ہمیشہ سے یہی حربہ رہا ہے۔ جب وہ کسی نام کی تاریخ کا کھوج نہیں لگا سکتے تو اسے کسی متشابہ نام کا بگاڑ بتا کر گلو خلاصی کرتے ہیں۔

کسی بھی علاقے کی وجہ تسمیہ پانے کے لئے پہلی تحقیق اُسی خطے

کے قبائل یا اقوام کے بارے میں تحقیق کرنے سے شروع ہوتی ہے۔ اگر مصنفین سیستان کے قدیم قبائل کے بارے میں دیانتداری سے تحقیق کرتے تو ان پر آشکار ہوتا کہ حدود کرمان سے کوہ سلیمان اور بحر بلوچ تک اور قندھار سے لے کر تا سرحد سندھ اور کشمیر تک کے خطے کے اکثریتی قبائل تُرک اور کُرد (کوچ بلوچ نسل) ہوتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس خطے کے اکثر مواضع انہی دو اقوام کے طائفوں کے ناموں پر ہیں۔ کُردوں کے سینکڑوں طائفے اور گروہ مختلف حالات اور مختلف زمانوں میں یہیں سے ہجرت کر کے ایران و عراق و عرب ممالک میں جا بسے تھے لیکن عام نظریے کے برعکس دیگر خطوں سے ہجرت کر کے یہاں نہیں آئے تھے۔ ہاں البتہ اس کا ثبوت ملتا ہے کہ یہاں سے جانے والوں کی نسل سے کئی گروہ بعد میں واپس آ گئے ہیں۔ اس کی مثال خود کئی بلوچ قبیلے تھے جو کالدیا کی بادشاہت پر نمرود بلوچ کے جلوس کرنے پر ہجرت کر کے عراق وغیرہ پہنچے تھے تا کہ بلوچ حکمرانی کے سائے میں خوشحال زندگی گذار سکیں۔ لیکن جب نمرود بلوچ کی تیسری نسل کی حکمرانی زمین بوس ہوگئی تو جانے والے بلوچوں کے باقیماندہ گروہوں میں سے کئی طائفے دوبارہ اپنے وطن مکران کی طرف آئے۔

مذکورہ وسیع و عریض علاقے کا ایک بڑا گروہ کردوں کا سُوس قبیلہ

تھا۔ جسے سیس بھی کہتے تھے۔ یہ سیستانی زبانوں کے لہجے کا فرق تھا۔ عرب ''سیس'' کو ''شیث'' کہتے اور لکھتے تھے۔ سیستانی بلوچ اسے ''شُوش'' اور ''شیش'' ادا کرتے تھے۔ یہ سوس یا سیس یا شیث یا شیش اور شوش ایک ہی کُرد قبیلہ تھا جس کے سینکڑوں ذیلی طائفے تھے۔ جن کے نام قبیلے میں اندورنی طور پر شناخت کے لئے مستعمل تھے لیکن باہر کی دنیا میں تمام قبیلہ سوس/سیس وغیرہ کہلاتے تھے۔ یہ قبیلہ ایک وسیع خطے پر مال چرائی کرتا تھا۔ اسی سوس قبیلہ کے طائفے عراق، ایران وشام وغیرہ میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ وہاں ان کے ناموں کی یادگاریں آج بھی موجود ہیں جن میں مشہور شہر ''سُوس'' حلب، بلوص، زرنج وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

خراسان میں ''شیشان'' پاکستان کے راولپنڈی میں ''سوس'' مکران میں ضلع کیچ کے تُربت میں ''شوش ءِ ڈنّ'' وغیرہ بھی اِسی کرد قبیلہ کی یادگاریں ہیں۔ چونکہ سیستان کے خطے میں قدیم ترین اور اکثریتی قبیلہ کُرد بلوچوں کا سیس قبیلہ بود و باش رکھتا تھا اسی لئے اس کا نام اپنے اصل باسیوں کے نام پر ''سیستان اور سوستان'' مشہور ہو گیا۔ ساکستان ایک من گھڑت اور مفروضہ نام ہے جسکی کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہے۔

۳۔ میر کبر رئیس کا قبیلائی طائفہ ''بورسوار'' تھا رئیس اقوام میں یہ

اعلیٰ نسب اور معزز ترین طائفہ شمار کیا جاتا رہا ہے۔ اور اب بھی اُسی حیثیت میں ہے۔ ''بورسوار'' کے معنی ''گھڑسوار'' کے ہیں۔

رئیسوں کی یہ سردار گھرانہ نسل تُرک حکمرانوں (رئیس) کے ''شاہی گھڑسوار'' محافظ ہوتے تھے۔ جو نہ صرف رئیسوں (ترک حکمرانوں) کی حفاظت کرتے تھے بلکہ قلعوں کے بھی محافظ ہوتے تھے جو ہمہ وقت زرہ پوش اور مسلّح ہوتے تھے اور راہوار گھوڑیوں پر سوار ہوکر اپنے اپنے علاقے میں گشت کرتے تھے۔ یہ لوگ دشمن کے علاقوں میں اندھیری راتوں میں گھس کر حملے کرتے اور لوٹ مار بھی کرتے تھے۔ تُرک نسل کا یہ قبیلہ حیاداری اور غیرت کے معاملات میں نامدار ترین اور قتل و غارتگری میں ظالم ترین قبیلہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ کرمان، مکران اور کیسپین کے خطّوں میں بہادری اور حکمرانی کی لازوال تاریخیں رقم کرنے والا قبیلہ یہی رہا ہے۔ تُرک حکمرانوں کے اکثر امیر البحر اسی قبیلہ رئیس سے ہوگذرے ہیں۔ جنہوں نے بحیرہ عرب پر پُرتگیزی بالادستی کے خواب کو چکنا چور کردیا تھا۔ یہ قبیلہ خود کو مکران کا بنیادی وارث اور اُس کی سرزمین کو اپنی مقدس ماں سمجھتا ہے شاید یہی محبت تھی کہ اس شاہی قبیلہ نے ڈھائی سو سال تک مکران کے وسیع خطے میں جگہ جگہ بلوچی یلغاروں کا دفاع کیا۔ آخر کار مغلوب اور کمزور ہوکر بھی

اپنی مقدس سرزمین کو چھوڑ کر نہیں گیا اور بلوچ رواداری کے سامنے مغلوب ہو کر اس قوم کا اٹوٹ حصہ بن گیا۔

۴۔ بلوچی عسکری نظام کے تحت ''راہزن'' ایک دفاعی عہدہ ہوتا ہے راہزن، دوران جنگ لڑائی پر نظر رکھتا ہے، اسلحہ کی بروقت کمی کا تدارک اور سپلائی کا انتظام کرتا ہے۔ اپنی فوج کے جرنیل کو لمحہ لمحہ کی کیفیت سے باخبر رکھتا ہے۔ زخمیوں کو میدان جنگ سے نکالنے کا اہتمام کرتا ہے۔ جنگ کے لئے جانے والے لشکر کے آگے آگے جانے کے راستوں کا تعین کرتا ہے اس کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ کہیں شکست خوردہ دشمن پیچھے نہ بھاگ سکیں۔ جنگ سے بھاگنے والے یا دشمن کے لئے جاسوسی کرنے والے کا فوری قتل بھی راہزن کے فرائض میں شامل ہے عام طور پر دوران جنگ راہزنوں کی تعداد پندرہ سے پچاس تک ہوتی ہے۔

۵۔ بلوچی قبائلی نظام میں پہلوان کا ایک ادارہ ہوتا تھا۔ جس کے منصب دار جو پہلوان کہلاتے تھے، قبیلہ کے شاعر ہوتے تھے۔ جن کا کام زمانہ امن اور جنگ میں اہم سرگرمیوں اور ماضی و حال کے وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو شعروں کے قالب میں ڈھالنا، شاعروں کے کہے ہوئے اشعار کو حفظ کرنا اور بلوچی دیوانوں اور محفلوں میں انہیں دوسروں تک پہنچانا اور

قبائل میں پھیلانا ہوتا تھا۔ چوں کہ ایسی منظوم داستانیں چشم دید ہوتی اور ہر وقت دُھرائی جاتی تھیں اور سینکڑوں لوگوں میں پھیلا کر انہیں سینوں میں محفوظ کرایا جاتا تھا اس لئے یہ تاریخی سند کا درجہ پاتی تھیں۔ نوشت وخواند سے محروم قبائل اسی قومی ادارے کے توسط سے اپنے تاریخی واقعات اور شجرہائے نسب وغیرہ سینکڑوں سینوں میں منتقل ومحفوظ کراتے تھے۔ یہ قومی پہلوان قبیلائی پیداوار و آمدن میں باقائدہ حصّہ دار ہوتے تھے۔ دوران جنگ یہ طبقہ لشکروں میں بھی شامل ہوتا تھا۔ اور واقعات کا مشاہدہ کرتا تھا۔ یہ لوگ قبیلہ کی طرف سے لڑتے نہیں تھے۔ انہیں لڑنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی تھی تا کہ وہ صرف اپنے فرائض ہی تک محدود رہیں۔

۶۔ کمبر، پہاڑی چراہوں کا کوئی سردار نہیں تھا جیسے کہ ہنری پوٹنگر نے لکھا ہے۔ پہاڑی چرواہوں کا الگ کوئی سردار نہیں ہوتا۔ سردار قبیلہ کا ہوتا ہے۔ کمبر اتنا معمولی سا شخص ہوتا تو سیوا قلات کے فوج بردار حکمرانوں کو اُسے سینکڑوں میل دور پنجگور سے اپنی مدد کے لئے بُلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کمبر کو اپنی مدد کے لئے آواز دینا خود ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے خطّے کا ایک زبردست طاقتور حکمران تھا جس کی بہادری کی شُہرت قلات کے علاقے تک پہنچ چکی تھی۔ اور سیوا قلات کے حکمرانوں کو یقین تھا

کہ انہیں اگر قبائلی ڈاکوؤں یا حملہ آوروں سے کوئی طاقت تحفظ دے سکتا تھا تو وہ میر کمبر ہی تھا۔ یہ ہنری پوٹنگر کی کم علمی ہے کہ ایک خطّے کے طاقت ور حاکم کو وہ پہاڑی چرواہوں کا سردار کہتا ہے۔

۷۔ مصنّف کا خیال غلط ہے۔ میر کمبر کسی حبشی نسل سے نہیں تھا۔ بلکہ وہ قدیم نامی گرامی اور لڑاکو قبیلہ رئیس کے ''بورسوار'' طائفہ سے تھا۔ سلطنت مکران کے علاقے ''سرحد'' اور ''پنجگور'' کی زمین کا چپہ چپہ میر کمبر رئیس کی مہمات اور فتوحات کا گواہ ہے۔ طائفہ ''بورسوار'' کے لئے اشاریہ نمبر۳ ملاحظہ کریں۔

۸۔ جہاں تک ہنری پوٹنگر کے بیان کردہ سیوا کے بیٹے سنگین کی بات ہے جسے اُس نے زہری میں اپنے باپ کا نائب بیان کیا ہے اس کی بھی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ علاقہ زہری میں کسی بھی ہندو حکمرانی کی روایت نہیں ملتی۔ البتہ ایک قلعہ بنام سنگین قلات (پتھروں سے تعمیر کردہ قلعہ) موجود ہے جس کے دعویدار نورگامہ کے رئیس ہیں۔ جو اسے اپنے قبیلہ رئیس کا تاریخی قلعہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی تعمیر کو ساڑھے چار سو سال ہوتے ہیں۔ (2002ء کی روایت ہے) جو پھر گجر قبیلہ کے قبضے میں آیا۔ جسے تیس سال بعد زہری رند نے گجر قبیلہ سے چھین لیا۔ یاد رہے کہ بیتو رام

نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب زہری اس علاقے میں آیا تو رئیس قبیلہ اس سے بہت پہلے وہاں پر بالا دست تھا نیز نام ''سنگین'' کوئی ہندوانہ نام بھی نہیں ہے بلکہ سو فیصد بلوچی نام ہے اور یہ نام بلوچ مردوں اور عورتوں میں مشترک ہے۔ اس کے علاوہ لانگوؤں کا ایک قدیم ترین طائفہ ''شالی'' کی روایت ہے کہ سحرائی یا سیرائی ان کے آباواجداد کا طائفہ رہا ہے جو قلات پر بالادستی رکھتے تھے۔ اُن کا قدیمی علاقائی تعلق پنجگور کا موضع گچک رہا ہے۔ ان کا ایک سردار یا حاکم راہو سیرائی رہا ہے جس کے ایک بیٹے کا نام سنگین اور دوسرے کا بادین رہا ہے۔

۹۔ قلات پر اس زمانے میں کسی ہندو کے حکمران ہونے کی بات تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ سیوا حاکموں یا حکمرانوں کی اصطلاح غلط طور پر مروج لگتی ہے کیوں کہ تاریخ قلات کے ضمن میں کسی راجہ سیوا کی حکومت کی سند نہیں ملتی اور نہ کہ ہمسایہ خطوں کی تاریخ میں اس نام کے کسی حکمران کا تذکرہ ملتا ہے۔ سیوا حاکموں کی بات اے ڈبلیو۔ ہیوز نے ''دی کنٹری آف بلوچستان'' میں روایتاً لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ روایت یہی ہے کہ میروانیوں کے عہد سے پہلے قلات میں ایک مسلمان خاندان حکومت کرتا تھا جو سحرائی کہلاتا تھا۔ اس خاندان کی جگہ ایک ہندو خاندان نے لے لی۔ لیکن یہ معلوم

نہیں کہ ان خاندانوں کے حکمرانوں نے کب اور کتنا عرصہ حکومت کی۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ سیوا خاندان کا خاتمہ میر کمبر کے ہاتھوں ہوا۔ اپنی کتاب "سفرنامہ سندھ و بلوچستان" میں ہنری پوٹنگر لکھتا ہے کہ

"یا تو اس ہندو خاندان کے آخری حکمران کا نام سیوا تھا یا پھر یہ کوئی خاندانی لقب تھا۔ جو اس خاندان کے لوگ اقتدار پر آتے وقت اختیار کرتے تھے .....سیوا خود قلات میں مستقل قیام کرتا تھا اور اس کا بیٹا سنگین اس کے نائب کی حیثیت سے زہری میں بودوباش رکھتا تھا۔"

انگریز مصنفین اے ڈبلیو ہیوز اور ہنری پوٹنگر کی بیان کردہ درج بالا روایتیں، تحریری تو اپنی جگہ، روایتی سند بھی نہیں رکھتیں۔ ہیوز نے قلات پر حکمرانی کے ضمن میں میروانی قبیلہ کا نام بھی روایتاً تحریر کیا ہے جو انہوں نے آخوند محمد صدیق کی فارسی کتابچہ "اخبار لابرار" سے اخذ کیا ہے جو سراسر غلط اور غیر تاریخی بات ہے۔ میروانیوں کا سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں

میر بجّار براہو میروانی کی سرکردگی میں جدگالوں کے ساتھ انتقام گیری کی لڑائی سے پہلے سوراب کی سرداری کے علاوہ کہیں کوئی تذکرہ حکمرانی نہیں ملتا۔ براہو جدگال جنگ میں فتحیاب ہونے کے نتیجے میں قلّات میں اس کا التازئی اتحادی میر احمد برسر اقتدار آیا۔ جو قلات کا سابقہ حکمران قبیلہ رئیس کے ایلتازئی طائفہ سے تھا۔ جس کے نام سے پھر احمدزئی خاندان وجود میں آیا۔

ہماری تحقیق میں تمام علاقہ قلات کے قبائل میں میروانی بالادستی کا کوئی تذکرہ سننے میں نہیں آیا۔ نہ کہ سیوا خاندان کی حکمرانی کی بات کی کہیں سے کوئی روایت ملی۔ قلات کے ہندوؤں میں ایک طائفہ سیوازئی کے کچھ لوگ موجود ہیں جن کے دو گھر خضدار میں بھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کا طائفہ کوئی ساڑے تین سو سال قبل ملتان سے نکال دیا گیا تھا (1988ء کی روایت ہے)۔

پوٹنگر کے مندرجہ بالا بیان پر ملک سعید بلوچ نے اپنی تصنیف ''بلوچستان تاریخ کی روشنی میں'' لکھا ہے کہ تاریخ کے اوراق ہندو حکمرانی کے تذکرے سے خالی ہیں۔ عموماً روایت یہی ہے کہ قلات میں سب سے پہلے ایک مسلمان خاندان سحرائی برسرااقتدار آیا تھا۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ یہ

معلوم نہیں کہ وہ کونسا سیاسی وسماجی پس منظر تھا کہ جس کی بنا پر ایک ہندو خاندان کو عہد وسطیٰ میں قلات میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کا موقہ ملا۔ نیز دیکھئے ''قلات سیوا''۔

۱۰۔انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد سوئم، نہم ایڈیشن۔

۱۱۔''بروہی خوانین'' کی اصطلاح غلط استعمال کی گئی ہے۔ میر کمبر رئیس نے ''رئیس خوانین'' کی بنیاد رکھ دیا تھا۔ انہی رئیس خوانین کے خاندان سے میر احمد ایلتازئی رئیس اور میر محراب ایلتازئی رئیس نے میر بجار میروانی کے عہد میں جدگالوں کے خلاف لڑائی میں میروانی کے ''براہو'' طائفے کا ساتھ دیا۔ براہو طائفہ کا اتحادی ہونے کی نسبت سے وہ براہوئی کہلائے۔ میر کمبر رئیس کے وقت براہوئی اتحادیہ کی تشکیل نہیں ہوئی تھی لہذا ''براہوئی'' لفظ یا اصطلاح وجود نہیں رکھتا تھا۔ براہوئی اتحادیہ کا پہلا خان میر احمد خان ایلتازئی رئیس تھا۔ جس سے پھر احمدزئی طائفہ تشکیل پا گیا۔ سب سے پہلے لفظ ''براہوئی'' کا استعمال سندھی مورخین نے خان عبداللہ خان بلوچ کے لئے کیا۔ سندھی تاریخ تحفتہ الکرام'' (فارسی) میں مصنف نے انہیں ''براہوئی خان'' لکھا اور ان کا شجرہ نسب اس طرح درج کیا ہے۔

''عبداللہ خان بن سمندر خان بلوچ

بروہی، زمیندار عمدہ سرحد قندہار"

(صفحہ 422 بخش اوّل، جلد سوئم)

۱۲۔ پنجگور ضلع کے گچک" گاؤں میں میر کمبر رئیس کے تاریخی قلعہ کے زمین بوس آثار "کمبر دمب" کی صورت میں اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جو نہایت تیزی سے زوال پذیر ہیں۔

۱۳۔ میر کمبر رئیس کے زمانے میں علاقہ زہری میں عددی اکثریت گُجر اور چھٹہ جدگال قبائل کی تھی۔ زہری رند چھوٹا مگر طاقتور قبیلہ تھا اور جنگجو قبیلہ تھا لیکن علاقہ پر بالادستی نہیں رکھتا تھا۔ اُسے گجّروں کی حمایت حاصل تھی لیکن چُھٹہ جدگال قبیلہ ان کا مخالف تھا۔ اور اُن سے قدیم تر تھا۔ رئیس اور چھٹہ قدیم تر ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ منظّم اور سیاست کار تھے۔ رائے بہادر ہیتو رام نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب زہری اس علاقے میں آیا تو رئیس قبیلہ پہلے سے قابض تھا۔ رئیس نے زہری کے ساتھ انجام کر کے علاقے پر کنٹرل رکھا (359)

یہ اور ایسے چند دیگر وجوہات کی بنا پر میر کمبر کو سرِ سرداران جہلاوان کے اہم منصب پر اپنے ہی قبیلہ کی اہل شخصیتوں پر اعتماد کرنا پڑا۔ اس لئے انہوں نے اس منصب پر زہری ہی کے شیر خان زئی رئیس طائفہ کے میر

تاج محمد خان کو مقرر کیا۔ اور سرِ سرداران سراوان کے منصب پر چھپر قلات کے رئیسوں کی عمرزئی شاخ کے میر ہیبت خان رئیسانی کا تقرر کیا۔ زرک زئی کو اس منصب پر اُس کے فوجی خدمات کے صلے میں سردار موسیانی زہری کی سفارش پر میر نصیر خان اوّل کے زمانہ اقتدار میں تعینات کیا گیا۔ اس سے قبل میر احمد خان ایلتازئی کے عہد اقتدار میں انہوں نے یہ منصب اپنے ایلتازئی طائفہ کے پاس رکھا تھا۔ واضح ہو کہ زرّک، میر احمد خان ایلتازئی (جدّ احمدزئی) کے ساتھ براہوجدگال جنگ میں میروانی کا اتحادی تھا۔ جسے میر بجّار براہو نے مسّ کا علاقہ خدمات کے صلے میں دیا تھا۔

۱۴۔ ''سفرنامہ قلات'' اُردو ترجمہ از پروفیسر انور رومان 226-225

۱۵۔ زہرو رئیس کی نسل زہروزئی کہلائی جو پروم پنجگور سے لے کر تا علاقہ کوہگ (ایرانی بلوچستان) زبردست طاقت اور اکثریت کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔ کبھی کوہگ، سراوان اور آس پاس کے تقریباً گیارہ قلعے اسی قبیلہ کے رہے ہیں۔ یہ قبیلہ رئیس اب بھی اپنی جنگجویانہ صفات سے متصف ہے۔

۱۶۔ اس ''حمزہ'' کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہی مشہور و معروف ''حمزہ'' ہے جسے مکران کے رئیس، جہلاوان کے میروانی، قلات کے احمدزئی اور رند قبائل اپنا روایتی جدّ بتاتے ہیں یا وہ ''حمزہ'' اس ''حمزہ'' سے چند پُشت مزید آگے

ہے۔ ہمارے خیال میں ''حمزہ اوّل کو اس حمزہ سے بہت آگے ہونا چاہیے۔ جہاں تک مذکورہ قبائل کے شجرہ ہائے نسب کی میر حمزہ نامی شخص تک پہنچنے کا تعلق ہے رئیس اور اس کی شاخوں (میروانی، احمدزئی، رئیسانی، ہوت، ٹالپر، جاموٹ وغیرہ) کے شجرے میر حمزہ نامی شخص تک موجود ہیں لیکن رند قبائل کے کسی طائفہ کا شجرہ کسی حمزہ نامی شخص تک نہیں پہنچتا۔ اس بے ثبوتی کے باوجود ان کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی میر حمزہ کی نسل سے ہیں۔ یقیناً انہوں نے یہ نام اور اس کی شہرت مکران میں اپنے قیام کے دوران سن کر اس روایت کو اپنایا ہوگا۔ ان کا نسب نامہ کسی ''اعلمش رومی'' تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے (اعلمش رومی کے نام سے مغربی (ایرانی) بلوچستان کے رندوں میں طائفہ ''آرامش'' صدیوں سے موجود ہے۔) اور کسی بھی پُشت پر کسی حمزہ کا نام نہیں آتا۔

قلات سیوا

بعض مورخین کا استدلال ہے کہ قلات پر میر کمبر رئیس کے قبضہ کے وقت وہاں کسی سیوا راجہ کی حکومت تھی جس کے ماتحت زہری کا علاقہ بھی تھا۔ جہاں پر اُس کا ایک سنگین نامی بیٹا حکومت کرتا تھا۔ بعض نے سیوا کو ایک ہندو خاندان کہا ہے۔ جنکا یہ ایک سرکاری خطاب تھا۔(ا) بعض نے سیوا کی نسبت سے ''سیوائی قبائل'' کی اصطلاح بھی گھڑلی (2) اور اسے کہیں '' سیوائی دراوڑ'' اور کہیں '' سیوانامی کوشانی خاندان'' کا نام دیا (3) ان میں میر گل خان نصیر مرحوم کا نام سرفہرست ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مرحوم نے '' سیوائی دراوڑ'' کی اصطلاح کُردی (موجودہ براہوئی زبان) کے لئے دراوڑی ہونے کا جواز پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ چند ایک محقیقن نے قلات اور اس کے قرب وجوار میں کسی بھی سیوائی حکومت کی موجودگی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ ضروری قرار پاتا ہے کہ سیوا کے بارے میں مختصر سا جائزہ پیش کیا جائے۔

اکثر محققین نے سیوا، سیوائی، سیوی، سیوہن اور سیو کو ایک ہی نام '' سیوا'' کی مختلف شکلیں قرار دی ہیں۔ جناب جسٹس (ریٹائرڈ) خدا بخش

بجارانی مری لکھتے ہیں کہ:۔

''اسلام سے قبل قلات اور جھلاوان
کی پہاڑیاں ہندو یا بدھ حکمرانوں
کے ماتحت تھیں جو '' سیوا''
کہلاتے تھے اور لفظ '' سیبی''
اس سے مشتق ہے ''(4)

سبی کے ضمن میں شکارپور کے ایک جت خاندان نے جو قدیم باشندے سبی کے رہے ہیں اپنی خاندانی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سبی نام کا تعلق سیوی یا سیوا وغیرہ سے نہیں بلکہ سبی کو آباد کرنے والے جت تھے جو کہ ایرانی بلوچستان کے علاقہ ''سِبّ'' سے ہجرت کر کے آئے تھے اور چوٹیالی کے اس مقام پر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں وہ اپنے اصل وطن ''سبّ'' کی نسبت سے '' سبی''، مشہور ہوئے۔ یعنی سب سے آنے والے (5)

سیوستان پر بحث کرتے ہوئے ایک محقق ممتاز حسین پٹھان لکھتے ہیں کہ ''سیوستان کا نام قدیم زمانے میں سندھ کی وادی میں بود و باش رکھنے والا ''سیو'' یا ''سیوی'' قبیلے کے نام پر رکھا گیا ہے''۔ سیوی قبیلہ قدیم تواریخ میں مذکور ہے۔ ''پری بدھسٹ انڈیا'' میں سیوی کو ایک خاندان کہا گیا ہے

۔جس کے آٹھ بادشاہ ہوگذرے ہیں۔ جودرج ذیل ہیں:۔

1۔سیوی۔2۔بجنا۔3۔وسنترا۔

4۔جالی۔5۔کہنا۔6۔مادا۔

7۔پھساتی۔8۔مادا۔

اسی طرح مسٹر راگوزین نے ''جُھنکا'' کہانیوں میں بیان کردہ وسنترا کی کہانی کے حوالے سے کہا ہے کہ وسنترا بڑا انخی بادشاہ تھا۔اوراس کی حد سے زیادہ سخاوت کی بنا پر سیوی عوام اور طاقتور اُمرانے اسے ملک سے نکال دیا تھا ۔جُھنکا کہانیوں کی رو سے سیوی خاندان کا پہلا بادشاہ اُسرانا تھا جس کا بیٹا'' سیوا'' تھا جس نے سیوا پور کی بنیاد رکھی۔سیوا پور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ موجودہ جھنگ اور شورکوٹ کا درمیانی علاقہ تھا۔

تاریخ مغربی پاکستان'' کے مصنف سیوی کے ضمن میں رتی لال مہتہ اور دیگر محققین کی تحقیقات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

'' پری بُدھسٹ انڈیا'' اور'' ویدک انڈیکس'' کے مصنفین نے شواہد سے ثابت کیا ہے کہ بارہ سو سال قبل مسیح سے لیکر آٹھ سو سال قبل مسیح تک

کے زمانے میں ایک سیوی ریاست موجود
تھی۔ اسی طرح ''پولیٹیکل ہسٹری
آف ''اینیشنٹ انڈیا'' کے مصنف
نے لکھا ہے کہ جب سکندر مقدونی تین
سو سال قبل مسیح میں وادی سندھ
میں داخل ہوا تھا تو سیوی کی
ریاست موجود تھی البتہ اس کا نام
سیوی سے بی ہوگیا تھا۔اور
یہ نسل اس پورے علاقے میں پھیلی ہوئی
تھی جو شور کوٹ اور جھنگ کا درمیانی
علاقہ تھا۔''

بی کا سیوی خاندان سے کوئی تعلق بنتا ہے یا نہیں اس پر بھی محققین کی آرا مختلف ہیں۔اور زیادہ تر اختلافات سیوا کی نام نہاد حکمرانی سے متعلق ہیں۔جس کی نسبت سے ''قلات سیوا'' بیان ہوا ہے اور جسے قلات بلوچ کا قدیم نام مانا گیا ہے۔

''فرینٹر اینڈ اوور سیز ایکسپیڈیشنز فرام انڈیا'' میں ہے کہ سیوا ایک

ہندو خاندان تھا جو قلات پر حکومت کرتا تھا۔ اے ڈبلیو ہیوگز لکھتا ہے:

"قلات صدیوں سے ہندو حکمرانوں
کے ماتحت رہا تھا۔ جن کے آخری
حکمران کا نام یا تو سیوا تھا یا
پھر یہ اُن شاہزادوں کا لقب
تھا جو کہ وہ تخت پر بیٹھنے کے
بعد اختیار کرتے تھے۔"

امپیرل گزیٹیر آف انڈیا" ساتویں صدی کے بعد کسی سیوائی حکومت کو نہیں مانتا۔ مولوی دین محمد کی رائے ہے کہ سیوا خاندان کے ہندو راجے مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے حاکم رہے ہوں گے۔ وہ پھر لکھتے ہیں کہ۔

لازم نہیں آتا کہ وہ ہندو
مذہب کا بھی پیرو تھا"۔

یہی کچھ گزیٹر میں بھی بتایا گیا ہے۔ ایک بلوچ محقق جناب ملک سعید دہوار" سیوا" حکمرانی پر شک کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ معلوم نہیں کہ وہ کونسا سیاسی اور سماجی پس منظر تھا جس کی بنا پر ایک ہندو خاندان کو عہد وسطیٰ

میں قلات میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کا موقعہ ملا۔ ملک صاحب اُس زمانے کے سیاسی وسماجی پس منظر پر بحث کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس زمانے میں ایسے کوئی سماجی اور سیاسی حالات نہیں تھے۔ جن کی بنا پر ایک ہندو قلات میں برسر اقتدار آ سکتا۔ اسی طرح ریورٹی اپنی تصنیف ''نوٹس آن افغانستان'' کے صفحات 571-575 پر سیوی کی تاریخ پر بحث کرتے ہوئے سیوا حکومت کے بارے میں لکھتا ہے کہ عربوں کی فتح کے بعد کوئی ایسی تاریخ یا شہادت کا کوئی ایسا معمولی نشان موجود نہیں جس کی رو سے یہ ظاہر ہو سکے کہ کسی بھی ہندو مملکت کا اس علاقے کے کسی حصے میں کوئی وجود تھا۔ اگر ہم اس زمانے کے گرد وپیش کے حالات کا مختصر جائزہ لیں جب میر کمبر رئیس حاکم پنجگور ایک لشکر جرار لے کر قلات پر حملہ آور ہوا۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے سے موجود متعدد بلوچ قبائل علاقے میں اور مشرقی خطوں میں سندھ کی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھے۔ جو وقتاً فوقتاً آس پاس کی حکومتوں کو تنگ کرتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ شمال کی طرف سے آنے والے افغان خانہ بدوش بھی قلات کی پہاڑیوں تک کاروانوں کو لوٹتے رہتے تھے۔ مذکورہ بلوچ قبائل میں نہمردی، رند، مزاری وغیرہ کا نام خصوصی طور پر لیا جاتا ہے۔ رند قبائل پندرھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں قلات اور گردونواح میں پھیل

چکے تھے۔۔ جبکہ غیر رند بلوچ طائفے رندوں سے صدیاں پہلے علاقے میں موجود تھے اور اپنے جاٹ ہمسایوں سے ان کی وقتاً فوقتاً جھڑپیں بھی ہوتی رہتی تھی۔ اسلام کو بھی خطے میں پھیلے صدیاں گذر چکی تھیں اور تمام گرد و پیش پر مسلمان حکمران تھے۔ ایسے حالات میں قلات جیسے بلوچ اور اسلامی خطے پر کسی غیر مسلم حکمران کے تسلط کا تصور بھی غلط ہے۔

ہم قلات سیوا کے نام سے بالکل اختلاف نہیں رکھتے لیکن اس موقف پر بھرپور اختلاف رائے رکھتے ہیں کہ میر کمبر رئیس کے حملہ کے وقت کوئی ہندو ''سیوا'' کے نام سے قلات پر حکمران تھا۔ اور اُس کا بیٹا سنگین زہری میں اس کا نائب تھا جیسا کہ ہنری پاٹینجر نے لکھا ہے (6)۔ اس غلط موقف پر پہلا اعتراض تو یہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر حاکم ہندو تھا اور اس کی حکومت بلوچ قبائل کے ہاتھوں خطرے میں تھی اور وہ دیکھ بھی رہا تھا کہ آس پاس کی تمام حکومتیں مسلمانوں کی ہیں اور سرداریاں بلوچوں کی ہیں تو ایسے میں اس نے اپنی ہندو رعایا کو کیوں کر مدد کے لئے نہیں پکارا۔ اور سینکڑوں میل دور پنجگور کے میر کمبر رئیس کو مدد کے لئے کیوں آواز دی جسے چرواہوں کا ایک معمولی سردار کہا گیا ہے۔ اور جو ہندو نہیں مسلمان ہے اور مذہبی گھرانے کا بھی ہے جو ایک پیر اور بزرگ کی اولاد بھی ہے۔ جس سے

یقیناً راجہ کو اپنے اقتدار سے ہاتھ دھونے کا خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ دوسری طرف سندھ کا علاقہ تھا۔ جو قلات سے قریب تر تھا۔ جہاں کئی مقامات پر ہندو جاٹوں کی مضبوط سرداریاں قائم تھیں اور جو خود بھی طاقت ور تھے اور حکمرانوں کی عسکری مدد بھی بہ آسانی حاصل کر سکتے تھے اور جن پر بہ نسبت بلوچوں کے جو پہلے ہی سے راجہ کو تنگ کر رہے تھے وہ زیادہ اعتماد کر سکتے تھے۔ دوسری طرف زہری میں سیوا کا بیٹا سنگین حاکم بتایا گیا ہے۔ اُس زہری میں جو اُسی زمانے میں زہری بلوچوں کا مضبوط گڑھ تھا اور جو فوجی و عسکری لحاظ سے اس قدر مضبوط تھے کہ ہمسایہ حاکموں کو فوجی مدد بھی دیا کرتے تھے۔ زہری بلوچوں کی عسکری اور قبائلی طاقت کا تھوڑا سا تذکرہ ابوالفضل نے اپنی مشہور تصنیف ''آئینِ اکبری'' میں 1560ء میں کیا ہے اور ایسا ہی تذکرہ ''مآثرالامرا'' نے بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ:۔

''کیرتھر کے نہر دی بلوچوں کے
پاس ہی ایک اور بلوچ قبیلہ
رہتا ہے جس کو'' ظہری'' کہتے
ہیں کہ جہاں سے ایک ہزار سوار
مل سکتے ہیں (7)

جولوگ بلوچ قوم کی نفسیات کو جانتے ہیں تو بخوبی آگاہ ہیں کہ ایک بلوچ بھائی اپنے دوسرے بلوچ بھائی کو اگر وہ حقدار نہ ہو یا کمزور ہو حکمرانی کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کرتا تو ایک زبردست عسکری اور عددی قوت رکھنے والے قبیلہ نے ایک لاوارث ''سنگین'' (8) کو گدی پر کیوں کر برداشت کیا۔ جہاں تک سنگین کے نام کا تعلق ہے یہ سو فیصد بلوچی نام ہے ۔بلوچوں میں مردوں کے نام بھی سنگین رکھے جاتے ہیں اور عورتوں کے بھی۔ یہ نام آج بھی متعدد بلوچوں کا نام ہے۔ جبکہ ہندوؤں میں سنگین جیسا نام کم از کم ہم نے سنا نہیں ہے۔ اس مختصر سے جائزے کے بعد ہمیں دو راستے نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم مان لیں کہ ''سیوا قلات'' صرف شہر کا نام تھا اور علاقے پر حکمران بلوچوں کا کوئی قبیلہ تھا اور جس کے تعلقات اور رشتہ داریاں پنجگور کے رئیسوں سے پہلے تھے اور جسے میر کمبر کی جرات ،طاقت اور اثر ورسوخ کا پورا پورا علم تھا اور اُسے یقیناً میر کمبر سے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا اور ہنگامی حالات میں وہ میر کمبر کو اقتدار سونپنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوا ہوگا۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم ''سیوا'' کو واقعتاً ایک ہندو حکمران تسلیم کرلیں۔ اس صورت میں ہمیں میر کمبر کا زمانہ نو سو سال مزید پیچھے دھکیلنا ہوگا۔ تب جا کر کسی ''سیوا ہندو'' کے اقتدار کا جواز مہیا ہو سکے گا۔(9)

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ آئین اکبری اور دوسری تاریخوں میں قلات کو "قلات نیچارہ" اور "قلات بنجارہ" لکھا گیا ہے۔ قلات بنجارہ" دراصل قلات نیچارہ" ہی ہے جسے شاید غلط لکھا گیا ہے۔ لیکن "قلات سیوا" کا تذکرہ انگریز رائٹروں سے پہلے کسی نے نہیں کیا ہے۔ قدیم بلوچی شاعری میں قلات کے لئے "ملک سیوا" کا نام استعمال ہوا ہے۔ قلات سیوا نہیں ۔اور اُس پر ہندوؤں کی نہیں جدگالوں کی بالادستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ ذکر سترھویں صدی عیسوی میں کیا گیا ہے۔

جب مندرجہ بالا استدلال کی روشنی میں ہندو سیوا حکومت کو مسترد کیا گیا ہے تو اب لازم آتا ہے کہ "سیوا قلات" کی تحقیق کی جائے اور اس نام یا اصطلاح کی حقیقت کشائی کی جائے۔ راقم الحروف نے اس سلسلے میں قلات اور اس کے مضافات کے قدیم ٹیلوں، قبرستانوں اور دیگر آثار قدیمہ کے بارے میں پوری پوری تحقیق کی ہے۔ اس تحقیق کے دوران "سیوا قبیلہ" یا "سیوا خاندان" کا ایک بھی نشان دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہاں البتہ ایک قدیم مندر کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ جو کہ خوانین بلوچ کی میری یا قلعہ (قلات) کے ملبے کی تہہ میں کہیں تھا اور میری کے اوپر کی تمام منزلیں اس مندر کی چھت سے ہٹ کر بنائی گئی تھیں۔ خوانین قلات نے اس

زیر زمین مندر کو ہر دور میں احتراماً محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے اس لئے اس کی چھت پر انہوں نے میری کی کوئی دیوار یا کمرہ کھڑا نہیں کیا۔ خان محمود خان کے زمانہ (1893-1931ء) تک میری کی مشرقی جانب سے مندر کے لئے ایک لمبی زمین دوز سرنگ جاتی تھی جو مندر کی دوسری منزل پر پہنچتی تھی اور مندر کی نچلی منزل اور فرشی کمرہ جہاں پر بت رکھے ہوتے تھے، زمین کے نیچے پر ایک کمرہ بنایا گیا تھا تاکہ مندر کی اصل جگہ کو بے نشان ہونے سے بچایا جائے قلات کے ہندو کبھی کبھی اس سرنگ کے ذریعہ مندر میں جاتے تھے۔ اس مندر کا نام ''سیوا مندر'' رہا ہے۔(10)

قلات کی روایتی تاریخ سے واقف ہندوؤں نے ہمیں بتایا کہ دراصل قلاتِ بلوچ (قلعہ بلوچ) کا نام کبھی بھی قلات سیوا نہیں رہا ہے بلکہ سیوا مندر کی نسبت سے میری کا نام بھی سیوا قلات مشہور ہوا ہے۔ جو اس میری کے نیچے واقع تھا۔ ان کے مہاراج نے بتایا کہ ''سیوا'' درحقیقت ہندوؤں کا ایک قدیمی فرقہ رہا ہے جو کہ سیوا بتوں کے پجاریوں نے پوری دنیا میں اس کی تبلیغ کی، اس کے مندر بنوائے۔ انہوں نے اس مندر کے زوال کا سبب یہ بتایا کہ چونکہ یہ فرقہ کافی عرصہ پہلے نابود ہو چکا تھا اس لئے ان کا مندر بھی عدم توجہی کا شکار ہو کر گوشہ گمنامی میں چلا گیا اور دوسرے فرقہ

کے ہندو اس مندر میں نہیں جاتے تھے۔

ہندوؤں کی مذکورہ روایت معقول لگتی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ چونکہ قلات یعنی قلعہ ''مندر سیوا'' پر بنایا گیا تھا اور جگہ کا نام مندر کی نسبت سے سیوا مشہور تھا۔ اس لئے قلعہ کا نام بھی قلات سیوا شہرت پا گیا۔ جس کے معنی ''سیوا مندر والی جگہ کا قلعہ'' کے بنتے ہیں نہ کہ سیوا راجا کا قلعہ جیسے کہ بعض مصنفین نے تحریر کیا ہے۔ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ کسی سیوا نامی خاندان نے کبھی بھی قلات پر حکومت نہیں کی ہے۔ اب ہم اپنے موضوع کو تاریخی اسناد کے ساتھ مزید آگے بڑھائیں گے۔

معلوم ہوا کہ ''سیوا'' ہندومت کے قدیم عقیدوں میں سے ایک تھا۔ سیوا اور وشنو عقیدوں کی تبلیغ ہندوؤں کے پرانوں میں وسیع پیمانے پر کی گئی ہے۔ خصوصاً گپتا عہد میں ان دونوں عقیدوں کے لاکھوں پجاری پیدا ہوئے۔ جنہوں نے ''وشنو'' اور سیوا کے بت بنا رکھے تھے اور انہیں سجدہ کرتے تھے پھر ان مندروں اور بتوں کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنے اور مشہور ہوئے۔ ہندوؤں کے پرانوں میں مذکورہ دونوں دیوتاؤں کی متعدد صفات بیان کی گئی ہیں۔ 742ء سے 754ء تک نئے ہندومت کا پرچار ہوا جس میں تین دیوتاؤں کی پوجا کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا۔ ان

میں سے ایک ''سیوا'' دوسرا ''وشنو'' اور تیسرا ''کرشنا'' تھا۔ پہلے دو دیوتا ہندوؤں میں بہت پھیلے۔ نامی گرامی پرچاریوں میں شنکراچاریہ کا نام قابل ذکر ہے۔ جس نے انتھک تبلیغ کا کام سرانجام دیا۔ اس پرچار کے نتیجے میں سینکڑوں کے حساب سے ''سیوا'' اور ''وشنو'' کے مندر بنائے گئے۔ انہی سیوا مندروں میں سے ایک قلات کا سیوا مندر رہا ہے۔ جو کئی بار ایرانی ،غزنوی اور پھر ساہرائی بلوچوں کے حملوں کا نشانہ بن کر تباہ ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس مندر کے سب سے بڑے ملبے کے اوپر رئیس بلوچ حاکموں نے قلات یعنی قلعہ کی تعمیر کی۔ نئے قلعہ کے مشرقی طرف ایک بوسیدہ قلعہ بھی تھا جسے مسمار کر کے اس کی مٹی اور پتھروں سے رئیسوں نے اپنا قلعہ تعمیر کیا۔ جو قلات بلوچ کے نام سے مشہور ہوا۔ بعض مصنفین نے اس قلعے اور مندر کے بارے میں اشارے بھی دیئے ہیں۔ جیسے کہ ایس۔ جولین نے اپنی تصنیف ''ہیونسانگ'' میں اس کا تذکرہ کیا ہے (11) اسی طرح نیلسن انسائیکلو پیڈیا جلد سوئم میں میر کمبر کے حوالے سے اس قلعہ کے بارے میں لکھا ہے،۔

''میر کمبر نے راجہ کو شکست دی

اور قلات میں بروہی خوانین (12)

کی بنیاد رکھدی۔ اُس دن سے

پہلے قلات کو قلات سیوا کے
نام سے پکاراجاتا تھا ۔اس دن
کے بعد ''قلات بلوچ'' پکاراجانے
لگا''۔

ہندومت کے چھ اہم فرقوں سیوائی یا شیوائی، شکتائی ،گناپتی، سموراپتی وشنوئی اور سمرپتھی ہیں شیوائی یا سیوائی ،سیوایا شیوادیوتا کے ماننے والوں کو کہا گیا ہے ۔سیوایا شیوادیوتا کو تباہ کرنے والا کے نام سے موسوم کیا گیا ۔ہندوتاجروں نے اس تباہ کن دیوتا کی بڑی پبلسٹی کی اور پہاڑنشین اور سادھے شہری بلوچوں کواس دیوتا کی دہشت سے خوفزدہ کیا گیا۔

میگھاستھنے اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ ہریکلز، ڈیونیس، زیورس اور اومبریوس کی پوجا کرتے تھے ۔جوکہ کرشنا ،سیوا اور اندرا کے ناموں سے شناخت کئے جاسکتے تھے ۔اشوکا کا ایک بیٹا جلوکا ،سیوا کے مشہورترین پجاریوں سے تھا۔جس نے سیوادیوتا کے نام کے کئی مندرتعمیر کرائے تھے۔

یہاں ہم فرض کرسکتے ہیں کہ شاید قلات کے علاقے میں مذکورہ سیوا مندربھی اُسی زمانے کا تعمیر کردہ ہو جو بعد میں زوال پذیر ہوا لیکن اپنا قدیمی نام برقرار رکھ سکا۔اس طرح مندرجہ بالا تاریخی تحقیقی جائزے سے یہ حقیقت

کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ قلات پر کسی سیوا راجہ یا سیوا خاندان نے کبھی بھی حکمرانی نہیں کی ہے اور قلات کا نام قلات سیوا، دراصل سیوا مندر کی وجہ سے مشہور ہو گیا تھا۔

اشاریہ :-

1۔ ''سفر نامہ سندھ و بلوچستان'' از لیفٹننٹ ہنری پاٹنجر۔

2۔ میر گل خان نصیر اپنی کتاب ''بلوچستان ،قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں'' کے صفحہ 36 پر اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے ''سیوائی قبائل'' کی اصطلاح فرض کر لیا ہے۔ اسی کتاب میں ''سیوائی قبائل'' کے استعمال سے پہلے وہ ''ہندو خاندان'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور پھر اسے کوشانی خاندان کہتے ہیں۔ اور پھر اپنی دوسری تصنیف ''تاریخ بلوچستان'' کے صفحہ نمبر 3 پر وہ ''سیوائی دراوڑ'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک اصطلاح پر استقامت نہیں دکھاتے۔ اس کی وجہ محض یہی ہے کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں اس کا تاریخی سند پیش نہیں کر سکتے۔

3۔ تاریخ بلوچستان'' اور ''بلوچستان ،قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں'' نیز ''مختصر تاریخ قوم بلوچ اور بلوچستان'' از خان میر احمد یار خان بلوچ۔

4۔ بلوچستان، تاریخ کے آئینے میں۔

5۔ بہت سے مورخین نے ''جت'' اور ''جاٹ'' کو آپس میں غلط ملط کر دیا ہے اور انہیں ایک ہی گروہ کہا ہے خصوصاً پنجابی مصنفین نے۔ حالانکہ

درحقیقت یہ دو الگ الگ گروہ رہے ہیں۔ جاٹ قدیم سیتھی نسل شمارہ کیا جاتا ہے اور جو تاریخ کے قدیم ایام سے زراعت سے وابستہ رہا ہے اور مورخین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ جاٹ اور جٹ ایک ہی گروہ کے دو نام ہیں اور یہ نام ترقی یافتہ اور زوال پذیر پیشوں کی نسبت سے ہیں۔ جاٹ صدیوں سے کامیاب زمینداری سے وابستہ رہے ہیں اور یہ بہترین کاشتکار کے لئے مستعمل ہے جو زمیندار بھی ہو۔ جبکہ جٹ اسی گروہ کے خانہ بدوش کے لئے بولا جاتا رہا ہے۔ پنجاب کے جھنگ، سرگودھا، گجرات، گجرانوالہ اور گردونواح میں صدیوں سے جٹ کو جنگلی کہا جاتا رہا ہے۔ جنگلی کے نام سے بہت بڑا قبیلہ بھی معروف ہے اور یہی لوگ اپنے کو اصلی جٹ کہتے ہیں۔ اس موضوع پر ''دی جاٹ آف پاکستان'' از ڈاکٹر سگر ڈسیسٹ فُل ہیلبُش اینڈ ڈاکٹر ہیسنز ویسٹ فُل، بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر سیریز، ہسٹری آف جسٹس از ڈینزیل ایسٹن وغیرہا نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان محققین اور ان جیسے کئی دیگر مصنفین نے جت قبائل کو جٹ اور جاٹ سے الگ تسلیم کرتے ہوئے انہیں بلوچ نسل کے ''اونٹ پالنے والے پیشہ ور گروہ'' تسلیم کیا ہے اور انہیں رند، لاشاری اور کورائی کا برادر قبیلہ لکھا ہے۔ یہی کچھ ''دی جاٹ آف پاکستان'' کے مؤلف نے بھی لکھا ہے۔

6۔سفر نامہ سندھ وبلوچستان'' از ہنری پاٹنجر ،اردو ترجمہ از پروفیسر انور رومان، حصہ دوئم صفحہ نمبر 78۔

7۔مآثر الامراء حصہ دوئم صفحہ 363۔ہتورام نے تاریخ بلوچستان میں لکھا ہے کہ زہری قبیلہ رند قبیلہ ہے جس کا جد امجد زہری ولد زیرک رند تھا۔

8۔سنگین کوئی ہندوانہ نام نہیں ہے بلکہ سو فیصد بلوچی نام ہے۔ جسے مرد اور عورت دونوں پر رکھا جاتا ہے۔

9۔ملا خطہ کیجئے کتابیں ''ایک نظم ایک تاریخ'' براہوئی کون ؟اور'' براہو جد گال جنگ ءِ شر''۔

10۔امپیریل گزیٹر آف انڈیا ''بلوچستان سیریز'' میں کہا گیا ہے۔کہ ساتویں صدی عیسوی سے مسلمان حکمرانوں کی بالادستی رہی ہے اس لئے ہمیں کسی سیوا حکومت کا یقین کرنے کے لئے اس سے پہلے کا زمانہ تعین کرنا ہوگا۔اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ یہ سندھ رائے حکومت کا حصہ رہا ہو جن کے شجر ہائے نسب میں دو سہر ارائے آتے ہیں۔

11۔سندھ کے بلوچ مورخ رحیمداد خان مولائی شیدائی نے اپنی سندھی کتاب ''جنت السندھ'' کے صفحہ 68 پر لکھا ہے کہ قلات میں سیوا قلعہ کے نیچے بت خانہ ہے جہاں ''مہا کالی'' کا سنگ مرمر کا بت رکھا ہوا ہے

۔کتاب ''ہیون سانگ'' اول 137 پر مصنف ایس۔ جولین اس بات پر حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ چینی سیاح ہیون سانگ نے بلوچستان کے بت خانوں میں سے صرف بی کے بت خانے کی یاترا کی تھی۔

12۔ بروہی خوانین کی اصطلاح غلط ہے۔ میر کمبر رئیس نے ''رئیس خوانین'' کی بنیاد رکھدی تھی۔ وہ کئی پشتوں تک ''رئیس'' کہلاتے تھے۔ اور اُن کے شجرہائے نسب میں اب بھی ان کا قبیلہ رئیس لکھا ہوا ہے۔ ان دنوں براہوئی قبائل کی تشکیل نہیں ہوئی تھی۔ انہی رئیس خوانین کے خاندان میں سے میر احمد ایلتازئی اور میر مہراب ایلتازئی رئیس نے سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں جدگال قبائل کے خلاف براہو میروانی قبیلہ کا ساتھ دیا۔ ''براہو'' کا اتحادی ہونے کی بنا پر وہ ''براہوئی'' کہلائے۔

براہوا تحادیہ (براہوئی) کی منظوم تاریخ

زمانہ قدیم سے بلوچ قوم کا یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ اپنی قومی روایات ،حسب ونسب ،قبائلی ہجرتوں ،قبائلی وعلاقائی جنگوں کی تاریخ ،تسخیر ممالک کے واقعات ،خانہ جنگیوں کی روداد، قبائلی عروج وزوال کی داستانیں اپنے قبائلی شاعروں یا داستان گوؤں کے ذریعہ محفوظ کرتی اور سینہ بہ سینہ اپنی آنے والی نسلوں کو منتقل کرتی آئی ہے ۔قدیم بلوچی شاعری اپنی اس خصوصیت کی بنا پر ہمعصر زبانوں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتی ہے جس کا اعتراف تمام محققین اور مورخین کرتے آئے ہیں ۔اپنی تصنیف ''بلوچستان ،تاریخ کے آئینے میں'' جسٹس خدا بخش مری لکھتے ہیں کہ دنیا کی اکثر دوسری قوموں کی طرح بلوچوں نے بھی اپنے قبائلی دور کے مشہور تاریخی واقعات کو نظموں اور لوک گیتوں کی شکل میں محفوظ کرلیا ہے

......دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ طویل جنگوں کے واقعات اور نتائج لوک گیتوں اور نظموں میں محفوظ کر لئے گئے ہیں یہ نظمیں وغیرہ انہی لوگوں کی کہی ہوئی ہیں جو ان جنگوں میں بذات خود شریک ہوتے تھے(۱)

قدیم بلوچی شاعری کا زیادہ تر حصہ رزمیہ نظموں پر مشتمل ہے جن میں تمام تر تفصیلات قبائلی لڑائیوں کی ہے۔ایک محتاط اندازے کے مطابق دوسو سے زیادہ جنگوں کے واقعات ان نظموں اور گیتوں میں محفوظ چلے آرہے ہیں۔جن میں تقریباً دس طویل عرصے تک لڑی جانے والی جنگوں کی تفاصیل شامل ہیں۔یہ رزمیہ نظمیں تمام شعری محاسن سے مزین، پُر جوش جذبات سے بھرپور اور طویل ہیں۔یہ نظمیں یا منظوم داستانیں صدیوں سے سینہ بہ سینہ سفر کرتے ہوئے ہمارے زمانے تک پہنچی ہیں۔اس طویل سفر کے دوران داستانوں کے کئی مصرعے یا ٹکڑے گم ہوگئے ہیں اور بعض جگہوں پر واقعات کی کڑیاں ملنے نہیں پاتیں۔لیکن داستان نامکمل نہیں رہتا۔مذکورہ رزمیہ داستانوں میں اہم ترین رزمیہ داستانیں رندو لاشار کی تیس سالہ لڑائی اور جہلاوان میں لڑی جانیوالی ''براہوجدگال جنگ'' کی منظوم داستانیں ہیں۔دوسری رزمیہ داستان کو ہم زیادہ اہم سمجھتے ہیں جس میں پوری ''براہوئی'' تاریخ سمائی ہوئی ہے۔وہ براہوئی تاریخ جسکی تلاش وجستجو کے دوران بیسویں مفروضے قائم کیے گئے اور بیسویں جھوٹ لکھے گئے اور براہوئی تاریخ کے طالب علم کو اندھیرے راستوں پر گامزن کردیا گیا۔اُسے وہ تاریخ دکھائی گئی جس کا تمام تر چہرہ، جھوٹے واقعات، من گھڑت کہانیوں

اور مفروضوں کے بے رحم ناخنوں نے کھرچ کر بگاڑ دیا ہے اور جسے سچائی کے نایاب گوہروں کی موجودگی کے باوجود درست کرنے اور بنانے کی طرف کبھی توجہ نہیں دی گئی۔

مذکورہ رزمیہ نظم جو اس وقت تقریباً ساڑھے تین سو مصرعوں میں دستیاب ہے اندازاً تین سو سال سے سینوں مین محفوظ چلی آرہی ہے۔ انگریزی دور میں جھلاوان گزیٹئر نے اس کے تین سو بائیس مصرعوں کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔لیکن نظم کا نام بجائے ''براھو جدگال جنگ کی نظم'' کے ''براھوئی جدگال جنگ کی نظم'' تحریر کیا۔جس سے محققین اور مؤلفین کی توجہ اس طرف مبذول نہ ہو سکی۔وہ اس وجہ سے کہ لفظ ''براھوئی'' سے یہی تاثر ابھرتا ہے کہ قبیلہ پہلے ہی سے موجود ہے جس نے جدگالوں (۲) سے لڑائی لڑی ہے۔اگر یہ عنوان براھوئی کی بجائے اصل لفظ ''براھو'' لکھا جاتا تو پڑھنے والے ''براھو'' کی جستجو ضرور کرتے اور پوری نظم کا گہرائی سے مطالعہ کرکے براھوئی تاریخ تک کامیابی سے پہنچ جاتے۔اور انہیں یہ حتمی رائے قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ:۔

> ''برائیوں کی تاریخ یہ ہے کہ ان کی
> کوئی تاریخ نہیں۔'' (3)

اس منظوم داستان کا معروف نام براہ راست متصادم فریقوں کے نام پر ''براہو جدگال جنگ ءِ شئیر''، یعنی براہو اور جدگال کی لڑائی کی منظوم داستان'' ہے۔ براہو، میروانی قبیلہ کا سردار گھرانہ تھا جو سوراب میں متوطن تھا اور قلعہ نغاڑان کا مرکز تھا۔ یہ لڑائی اُن مقبوضات اور چراگاہوں پر لڑی گئی جن پر دونوں قبائل کا دعویٰ تھا۔

اس منظوم رزمیہ داستان کا شاعر میروانی قبیلہ کا ایک سردار خیل ملک دینار براہو (اول) کو کہا جاتا ہے۔ اور اسے یاد کرنے اور قبائل میں پھیلانے والا میروانی غلام گوشو تھا جس کی وجہ سے اس داستان کو گوشو ءِ شئیر '' بھی کہا جاتا ہے اور زیادہ تر اسی نام سے مشہور ہے۔

یہ منظوم داستان ''براہوئی تاریخ'' کا واحد ماخذ ثابت ہوا ہے جس میں پوری براہوئی تاریخ (براہوئی زبان کی نہیں) سمائی ہوئی ہے جسے نام نہاد مورخین نے تاریخ کا پیچیدہ ترین مسئلہ بنایا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس منظوم داستان کے حوالے سے براہوئی تاریخ بیان کریں یہ مناسب رہے گا کہ اُن جھوٹے واقعات اور من گھڑت مفروضوں کا بھی ذکر کریں جنہیں براہوئی تاریخ کا نام دیا گیا اور تاریخ کے قارئین کو گمراہ کیا گیا۔ یہ مورخ خود بھی تاریخ کے کٹہرے میں جھوٹے بن گئے۔

براہوئی وجہ تسمیہ:- کسی بھی قوم یا قبیلہ کی تاریخ نویسی کی ابتدا عموماً اُس کے نام کی تشریح سے شروع ہوتی ہے۔ ''براہوئی'' کون تھے۔اس کا جواب انگریزی دور کے ہندو آفیسر رائے بہادر ہیتو رام نے یوں دیا۔

> ''روہی پہاڑ کو کہتے ہیں اور فارسی کا ''با'' بمعنی ساتھ ہونا کے ہیں ۔اس طرح لفظ ''باروہی ''بمعنی پہاڑ والا''یا پہاڑوں میں رہنے والا کے ہیں ۔چونکہ یہ لوگ قدیم وقت سے پہاڑوں اور ان کے دامن میں رہتے ہیں اس لئے باروہی اور پھر کثرت استعمال سے بروہی کہلائے''

ہیتو رام کا مفروضہ ''با۔روہی'' دو زبانوں سے مل کر بنا ہے ''با'' جیسا کہ اُس نے کہا ہے کہ فارسی کا لفظ ہے۔اور ''روہی'' سندھی کا لفظ ہے جس کے معنی ''پتھر'' کے ہیں۔دنیا میں کوئی لفظ ایسا نہیں ملیگا جس کا آدھا ایک زبان سے لیا جائے اور آدھا دوسری زبان سے اخذ کر کے ایک نام بنایا جائے۔یہ

ایک خودساختہ تشریح ہے۔ نیز پہاڑوں میں رہنے والے کوہستانی کہلاتے رہے ہیں نہ کہ باروہی۔ بیتو رام اور بعض دیگر محققین کا یہ کہنا کہ نام کثرت استعمال سے بدل جاتے ہیں ایک بہانہ اور غلط استدلال ہے۔ ناموں کے بدلنے کا امکان بہت کم اور معمولی ہوتا ہے۔ وہ بھی اُس علاقے میں جہاں کوئی نئی قوم آ کر آباد ہو جائے اور اُسے کسی دیگر قوم کا چھوڑا ہوا نام بولنے کو ملے تو ممکن ہے کہ اُس نام کی ادائیگی میں قدرے کمی یا بیشی ہو وگرنہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اس کی مثال خود لفظ بروہی ہے۔ جسے سندھ کے لوگ ادا کرتے ہیں۔ بلوچستان میں یہ نام ''براہوئی'' ہے نہ کہ بروہی۔ بلوچستان میں کوئی شخص اس نام کو بروہی نہیں بولتا اور سندھ میں ''براہوئی'' کسی سے ادا نہیں ہوتا۔

بیتو رام کے باروہی کے مفروضہ کو ''بلوچ قوم کی تاریخ'' کے مولف سردار خان گشکوری نے بھی اپنایا جس نے لکھا کہ آج بھی سندھ کے لوگ بروہی کے معنی ''قلات کے پہاڑوں کے لوگ'' لیتے ہیں۔ (4) شاید سردار خان کو معلوم نہیں کہ کسی زمانے میں تمام سراوان بشمول کوئٹہ وغیرہ کے ''کوہستان'' کہلاتا تھا اسی نسبت سے بلوچستان کے سراوان کے لوگوں کو پہاڑوں کے رہنے والے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اُس کے لئے باروہی نام وجود

نہیں رکھتا تھا۔ درحقیقت یہ خیال انگریز رائیٹر میسن کا پیش کردہ تھا۔ جسے ہیتو رام نے اپنایا۔

دوسری جگہ پر ہیتو رام نے حلب کے ایک مقام بروہ کا تذکرہ کیا اور لکھا کہ بعد از غدر امامین جب میر احمد مدینہ سے کوچ کر کے کوہستان حلب میں آیا اور سکونت خود بمقام ''بروہ'' اختیار کی تو بروہ کی نسبت سے وہ براہوئی مشہور ہوئے۔ (5) اس مفروضہ کو ''یادگار تاجپوشی قلات 1932ء کے مولف مولوی دین محمد اور ''ایک منزل تین راستے'' کے مصنف عبدالحلیم اثر افغانی نے بھی اپنایا۔ ہیتو رام نے مدینہ کے جس میر احمد کا تذکرہ کیا ہے ۔اُس کے بارے میں اُسے کچھ معلوم نہیں کہ یہ میر احمد کون تھا اور اس کا براہوئیوں یا بلوچوں سے کیا نسبت اور تعلق تھا۔ البتہ میر گل خان نصیر نے اپنی کتاب ''بلوچستان قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں'' کے صفحہ 20 پر لکھا کہ براہوئی کہتے ہیں کہ احمد خان مذکوران کا سردار تھا۔ لیکن میر گل خان نصیر کا یہ کہنا بھی غلط اور ایک من گھڑت بات ہے۔ براہوئیوں کو مدینہ کے کسی احمد خان کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔

براہوئی وجہ تسمیہ کے بارے میں دوسرا مفروضہ میر گل خان نصیر کا ''بُرزکوہی'' اصطلاح ہے۔ جسے انہوں نے ابوالقاسم فردوسی کے شاہنامہ میں بیان کردہ

واقعہ سے اخذ کیا ہے جس میں کوہ البرز کے گردونواح میں انوشیروان کے بلوچوں کے خلاف جارحیت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ کرمان میں واقع کوہ البرز کی نسبت سے میر گل خان نے برزکوہی کا شوشہ چھوڑا۔ چونکہ انہیں نام برزکوہی اور بروہی میں مطابقت نظر آ گئی تھی اس لئے انہوں نے بڑے دھوم دھام سے برزکوہی کی پبلسٹی کی:۔

"بروہی یا براہوئی دراصل برز کوہ
(البرز) کے کوچ وبلوچ قبائل تھے
جو نوشیروان کے تاخت وتاراج سے
جان بچاکر سطح مرتفع قلات میں
اپنے سردار میرو کی سرکردگی میں
ہجرت کرکے آئے تھے۔ چونکہ یہ
لوگ بُرز کوہ سے ہجرت کرکے
آئے تھے اس لئے یہاں کے سیوائی
قبائل میں بُرز کوہی کے نام سے
مشہور ہوئے جو مقامی زبانوں کے
تلفظ لہجے سے رفتہ رفتہ بروہی

براہوئی یا براہوی ہوگیا ۔" (6)

پھر لکھتے ہیں:۔

" یہ دعویٰ اب پایہ ثبوت کو پہنچ
چکا ہے کہ وہ کوچ و بلوچ جو
بُرزکوہ سے ہجرت کر کے آئے تھے
وہ یہی لوگ تھے جو آج کل براہوئی
قبائل کے نام سے مشہور ہیں ۔" (7)

عرب اور ایرانی روزنامچہ نویسوں اور سیاحوں نے کرمان کے مشرق اور جنوب میں کوچ و بلوچ قبیلہ کے تذکرے کئے ہیں جو اُن دنوں کافی طاقتور تھے اور ان کی آبادیاں موجودہ بحر بلوچ تک پھیلی ہوئی تھی ۔ان کا مرکزی شہر یا صدر مقام "ان کے اپنے نام پر "کوچ" تھا جو مغربی بلوچی میں کیچ کہا جاتا رہا ہے اور جسے عرب کیز لکھتے رہے ہیں۔ یہ کوچ یا کیچ موجودہ مکران کا مرکزی مقام ہے ۔ یہاں تک نوشیروانی افواج ان پر حملے کرتے رہے اور کوچ بلوچوں نے ایرانیوں کا بڑی دلیری سے مقابلہ کیا ۔ چونکہ علاقہ پہاڑی تھا اس لئے ایرانی افواج یہاں تک نہ سکے ۔اور کوچ و بلوچ (8) نے اپنے اس مرکز کے علاوہ کسی دوسرے دیار میں ہجرت نہیں

کی۔اس خطے کی کسی تاریخ میں البرز سے کوچ بلوچ قبائل کے کسی اجتماعی ہجرت کا واقعہ بیان نہیں ہوا ہے اور نہ ایسی کوئی تاریخی روایت کسی کو ملی ہے۔حتی کہ شاہنامہ فردوسی میں فردوسی ،نوشیروان کے لشکروں کے ہاتھوں ان کی بربادی اور نیست ونابود ہونے کی بات کرتا ہے لیکن اُن کے بھاگ نکلنے یا قفص کے پہاڑوں سے ہجرت کرنے کا ذکر نہیں کرتا۔تو کیا جناب میر گل خان نصیر کو بُرزکوہی نام پانے کا الہام ہوا تھا۔اور کیا یہ مہاجر گروہ کرمان وغیرہ سے بُرزکوہی کے نام سے چلے آئے اور قلات پہنچتے ہی بُرز کوہی کا نام بگڑ کر بروہی اور براہوئی بن گیا۔اور پورے علاقے میں کسی بھی مقام پر اُن کے پرانے نام بُرزکوہی کا کوئی نشان باقی نہیں بچا۔جبکہ اسی قلات ومستونگ کے خطے میں دو ہزار سال قدیم قبیلوں کے نام اور ان کے آثار باقی ہیں۔صرف برزکوہی قبیلہ کا نام راتوں رات بگڑ کر بروہی اور براہوئی میں بدل گیا۔سچائی یہی ہے کہ یہ سب من گھڑت اور فرضی قصے ہیں۔جنہوں نے براہوئی تاریخ کے چہرے کو مسخ کر دیا ہے۔

مصنف نے اپنے من گھڑت برزکوہی مہاجر لشکر کے سردار کا نام ''میرو'' بتایا ہے۔جبکہ اسی کتاب کے صفحہ نمبر 269 پر وہ ''میرو'' کی بجائے کمبر کو برزکوہی لشکر کا سردار لکھتے ہیں۔لیکن نہ وہ میرو کے بارے میں

معلومات رکھتے ہیں اور نہ کبر کے متعلق جانتے ہیں۔

اسی محولہ بالا پیرے میں لکھتے ہیں کہ یہ گروہ سطح مرتفع قلات میں آیا اور یہاں کے سیوائی قبائل میں (9) برزکوہی کے نام سے مشہور ہوا جو مقامی زبانوں کے تلفظ اور لہجے سے براہوئی یا بروہی ہوگیا۔ جبکہ تاریخ بلوچستان کے دوسرے ایڈیشن کے صفحہ نمبر 2 پر وہ ''سیوائی قبائل'' کی اصطلاح ترک کرتے ہیں اور اس کی جگہ پر ''یہاں کے دراوڑی زبان بولنے والے باشندوں'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن نہ انہوں نے ''سیوائی قبائل ''میں سے کسی ایک سیوائی قبیلہ کی نشاندہی کی ہے اور نہ کہ کسی دراوڑ قبیلہ کے باقیات کی۔ اسی تاریخ کے صفحہ نمبر 3 پر وہ محولہ بالا بیانات کو پھر بدل کر ''سیوائی دراوڑ'' استعمال کرتے ہیں اور ''بلوچستان، قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں'' کے صفحہ نمبر 267 پر وہ مندرجہ بالا تمام اصطلاحات کو بھول کر'' کوشانی باشندوں'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:۔

''اُس زمانے میں قلات پر سیوا
نامی ایک کوشانی خاندان کی حکومت
تھی۔ بلوچوں کا یہ نووارد خانہ
بدوش اور لٹا پٹا طبقہ جونوشیروان

کی سپاہ کے قتل عام سے بچ کر کوہ
البرز کی وادیوں سے یہاں آیا تھا
یہاں پر کوشانی باشندوں کی زبان
میں بُرز کوہی کہلانے لگا جسے رفتہ
رفتہ بگاڑ کر بروہی اور براہوئی کہا
جانے لگا۔''

یہاں پر ذکر کرنا ضروری ہے کہ قلات پر سیوا ہندو حاکمیت'' کی بات سب سے پہلے آخوند محمد صدیق نے اپنی کتابچہ ''اخبار الابرار'' میں پیش کیا تھا اور اُس نے سیوا کو پندرھویں اور سولہویں صدی کے وسط میں برسر اقتدار ظاہر کیا جس پر تمام محقیقن نے تنقید کی ہے اور آخوند کو ایک غیر معتبر راوی لکھا ہے۔

میر گل خان نصیر اسی ''سیوا'' کے گردان میں لگے ہوئے ہیں لیکن کہیں بھی بات بنتی دکھائی نہیں دیتا۔

خان قلات میر احمد یار خان نے اپنی کتاب ''مختصر تاریخ بلوچ اور خوانین بلوچ'' میں پہلے تو میر گل خان نصیر کے مفروضہ ''بُرز کوہی'' کو اُچھالا اور اسے براہوئی کی وجہ تسمیہ بتایا لیکن پھر اس کے ساتھ ''ابراہیمی'' کو بھی

نتھی کر دیا۔ ان کے مطابق:-

"کوہ البرز کا بلوچ طائفہ اپنے
سردار میر ابراہیم کی قیادت میں
سیستان وتوران میں داخل ہوا
قلات میں جب یہ لوگ پہنچے تو
ان کا بزرگ میر کمبر خان تھا لیکن
میر ابراہیم کے نام کی نسبت سے
یہ لوگ براہیمی کہلائے جو دراوڑ زبان
سے اختلاط کے بعد بگڑتے بگڑتے
براہوئی یا بروہی بن گئے۔" (10)

پھر براہوئی زبان کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:-

"اس کا نام بلوچوں کی نسبت
یعنی البرز کوہی سے مخفف
ہویا ابراہیمی سے بگڑ کر
بروہی بنا۔" (11)

ایک اور مصنف صالح محمد لاہڑی نے بھی اسی مفروضہ پر اکتفا گیا۔ اور

بروہی کو بُرز کوہی کا مخفف قرار دیا۔ایک اور نامی گرامی محقق سردار خان گشکوری نے ابن حوقل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے کتاب المسالک والممالک میں ''زم کرمانیاں، زم درمانیاں کے ساتھ زم بروہی کا بھی تذکرہ کیا ہے جو کوچ و بلوچ قبائل کے ساتھ صوبہ فارس اور اس کے گردو پیش کے علاقوں میں رہتے تھے (12) لیکن گشکوری صاحب کا کہنا غلط ہے۔ابن حوقل نے زم بردہی (Burdhi) لکھا ہے نہ کہ بروہی۔ایک اور مصنف مولانا نور احمد فریدی نے اپنی تاریخ بلوچ قوم اور اُس کی تاریخ'' میں براہوئیوں کو ایک شخص ''میر بروہی ولد دوست محمد'' کی اولاد قرار دیا ہے جبکہ واقعتاً نہ کوئی میر بروہی ولد دوست محمد کا وجود رہا ہے اور نہ کہ میر بروہی کوئی نام ہے۔یہ بھی دوسرے مفروضوں کی طرح ایک مفروضہ ہے۔

غیر مقامی اور غیر ملکی محققین نے براہوئیوں کی زبان (جس کا پہلا نام توریہ اور تورک Torak اور دوسرے دور کا نام کُردی ہے) کو سامنے رکھ کر مفروضوں کا انبار لگا دیا مثلاً ہنری پوٹنگر نے انہیں تاتار نسل سے بتایا جو سب سے پہلے جنوبی ایشیا میں آباد ہو گئے تھے (13) بیرول مہر چند اڈوانی نے انہیں میسو پوٹیمیا سے آنے والے لکھا جو دراوڑوں کے ساتھ آئے تھے (14)۔ یو۔وی۔ گینکوسکی نے انہیں دراوڑوں کے ماباقیات لکھا ہے

(15) ڈبلیو کروک نے لکھا ہے کہ یا تو براہوئی شمال مغربی سمت سے آنے والے مہاجرین (یعنی دراوڑ) کے آخری محافظوں سے رہے ہیں یا آگے جانے والے ان محافظین سے ہیں جو جنوب سے چلے ہوں گے (16) یہی کچھ پروفیسر رالنسن اور تھامس ہولڈچ نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنی کتاب ''فوکس آن بلوچستان اینڈ پشتون کوئچن'' میں لکھا کہ:-

براہوئی دراوڑ تو نہیں لیکن
وہ دراوڑوں کے ساتھ ایشیا کی
طرف آئے تھے۔ جس میں بروہی
قبیلہ بلوچستان میں ہمیشہ کے
لئے رہ گیا اور دین اسلام اختیار
کیا۔'' (17)

لسانیات کے ایک ماہر مسٹر گریئرسن نے براہوئیوں کو دراوڑوں کی اولاد لکھا جو ہندوستان کے قدیم باشندے تھے جو آریاؤں کی آمد سے قبل اس خطے کے مالک تھے اور آریاؤں کی ہندوستان پر یلغار سے یہ لوگ جنوب کی طرف ہجرت کر گئے جس کا ایک مختصر سا حصہ بلوچستان میں رہ گیا۔ اور براہوئی بولنے والے انہی دراوڑوں کی اولاد ہیں۔ اے۔ ڈبلیو۔ ہیوگز نے

لکھا کہ براہوئیوں کے آباواجداد کو حملہ آور آرین لوگوں نے ہندوستان سے نکال دیا تھا(18)

ایسے لگتا ہے جیسے مذکورہ تمام مصنفین نے قسم کھائی ہو کہ جو شخص بھی براہوئی زبان بولتا ہو وہ باہر سے آنے والا دراوڑ ہے۔ چاہے وہ دوسال پہلے کسی دوسرے شہر سے آ کر بروہی زبان اختیار کر چکا ہو۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہی مصنفین جب دراوڑوں پر تحقیق کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ نہ دراوڑوں کی اصل کا پتہ ہے نہ نسل کا اور نہ یہ معلوم ہے کہ یہ لوگ عراق سے ہندوستان کی طرف آئے تھے یا ہندوستان سے باہر گئے تھے۔ لیکن براہوئیوں کے معاملے میں دراوڑ کی گردان کرتے رہتے ہیں۔ درحقیقت یہ موضوع دو حصوں میں تقسیم ہے۔ براہوئیوں کی زبان ایک الگ موضوع ہے اور براہوئی قبائل ایک الگ موضوع ہے۔ براہوئی زبان کا براہوئی قبائل سے کوئی تاریخی یا قدیمی تعلق نہیں ہے۔ اُس کے ابتدائی بولنے والے کون سے قبائل تھے اور کہاں گئے۔ اس کا کھوج لگانا اب ناممکنات میں سے ہے۔ ہاں البتہ اس زبان کے دو ادوار کے دو ناموں کے حوالہ سے بحث کی جاسکتی ہے۔ ایک زمانے میں اس زبان کا نام ''توریہ'' اور پھر تورک (Torak) رہا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نام اس زبان کے سب

ممکن ہے یہ نام تیسرے یا چوتھے یا پانچویں دور سے پہلے دور کا نام رہا ہے۔ میں اس زبان کا نام رہا ہو اور سینہ بہ سینہ یہ لوگوں کی یادداشت میں چلا آ رہا ہے۔ تورک نام کے بعد اس زبان پر جو نام چسپان رہا ہے وہ کردی ہے۔ جس کے معنی کُردوں کی زبان کے ہیں۔ اس نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ کردوں نے یہ زبان اپنائی تھی لیکن کرد قبائل نے یہ زبان کس دور میں اپنائی اُس دور یا زمانے کا تعین کرنا بھی ایک نہایت ہی مشکل کام ہے۔ کیوں کہ لفظ کُردی کے بھی دوادوار رہے ہیں۔ پہلے دور کی کُردی بلوچی زبان کی مشرقی لہجے کی زبان کے لئے مستعمل رہا ہے۔ جسے بعد میں رند قبائل اور اُس کے اتحادیوں نے اپنایا۔ یہ روایت موجود ہے کہ رندوں کی آمد کے وقت بلوچوں کے مری، بگٹی اور مزاری قبیلے یہی کُردی زبان بولنے کی بنا پر ''کُردگال'' کہلاتے رہے ہیں۔ لفظ کُردگال'' کے معنی'' کردوں کی زبان بولنے والا'' کے ہیں

اصطلاح کُردگال بھی دوادوار میں مستعمل رہا ہے۔ ایسے اندازہ ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی کی شروعات میں لفظ توریہ اور تورک (Torak) کا استعمال ختم ہو چکا تھا۔ اور یہ زبان کُرد قبائل کے گھروں میں داخل ہو رہی تھی اور اس کا نام بھی کردوں کی نسبت سے کُردی ہو رہا تھا۔ سترھویں صدی

عیسوی سے لیکر اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط تک یہ زبان کُردی کے نام سے مشہور رہا ہے۔اور اس کے بولنے والے پھر دوسری مرتبہ ''کردگال'' کہلائے۔یعنی کردوں کی زبان بولنے والے۔معلوم ہوا کہ کُرد قبائل بلوچی کی مشرقی بولی چھوڑ چکے تھے اور موجودہ براہوئی زبان اپنا چکے تھے اور اسے اپنے قبیلے کا نام دے چکے تھے۔ابھی تک براہوئی قبائل کی تشکیل نہیں ہوئی تھی اور لفظ براہوئی یا بروہی وجود نہیں رکھتا تھا۔یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ 1960ء کی پہلی دہائی تک خضدار کے جنوبی اور مغربی علاقوں (اورناچ،نال،مشکے،آواران اور لس بیلہ وغیرہ) میں اس زبان کو براہوئی کے نام سے تیس فیصد لوگ بھی نہیں جانتے تھے اور وہ اُسے کُردی کہتے تھے۔خضدار کے اکثر بوڑھے اسے کُردی کہتے تھے لیکن براہوئی نام بڑی تیزی سے اس کی جگہ لے رہا تھا۔یہ اس چیز کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ نام ''براہوئی'' زیادہ قدیم نہیں ہے۔رائے بہادر ہیتو رام نے اپنی تاریخ بلوچستان میں براہوئیوں کی علاقے میں موجودگی کو 1907 سے تقریباً تین سو سال بتایا ہے۔لیکن اُس کے پاس ثبوت کے لئے کوئی سند نہیں ہے۔ہیتو رام کے علاوہ بھی اکثر مصنفین کو قدیم تواریخ میں لفظ براہوئی'' یا بروہی کا سُراغ نہیں ملا ہے اور وہ اس بات پر متفق ہیں کہ براہوئی نام کسی

قدیم تاریخ میں کہیں مذکورہ نہیں ہے اور یہ ایک جدید نام ہے۔ جسکی عقدہ کشائی صرف اور صرف براہو جدگال جنگ کی منظوم داستان کرتی ہے۔ یہ داستان نہ صرف براہوئی وجہ تسمیہ اور اسکی قدامت کی عقدہ کشائی کرتی ہے بلکہ یہ پوری براہوئی تاریخ کا واحد ماخذ ہونے کی بناپر اسکی امین بھی ہے۔

منظوم داستان کا خلاصہ: چونکہ مذکورہ نظم اس سے پہلے ہماری دو کتابوں، ایک نظم ایک تاریخ اور براہوئی کون" اور بلوچی کتاب "براہو جدگال جنگ ءِ شئیر" میں ترجمے کے ساتھ شائع ہوگئی ہے اس لئے یہاں پر صرف اس داستان کا خلاصہ تحریر کیا جاتا ہے۔

یہ رزمیہ داستان سوراب میں میروانی قبیلہ کے آرام وآسائش سے بھرپور خوشحال دنوں کے تذکرہ سے شروع ہوتی ہے جہاں پر قبیلہ کا سردار خیل طائفہ براہو موضع نغاڑ کے میروانی قلعہ میں پرلُطف زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ اس زمانہ میں میر عمر براہو ولد میرو (9) قبیلہ کا سردار اور علاقے کا حاکم ہے جو اپنی بیگم بی بی ماہناز کے ساتھ قلعہ میں رہائش پذیر ہے جہاں خاندان کے دوسرے لوگ بھی ہیں۔ انہی دنوں میں میر عمر براہو کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے اور اس کا نام بجار خان رکھا جاتا ہے۔ لڑکے کو بڑے نازونعم

میں پالا جاتا ہے جب قدرے بڑا ہوتا ہے تو اُس کو قرآن پڑھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

یہاں سے رزمیہ داستان میر عمر کے گھڑ دوڑ، نشانہ بازی، شکار وسیر کے مشاغل کے علاوہ اُس کی بہادری، لشکر وفوج اور اُس کی شہرت کے تذکرے کرتی ہے اور پھر اُس کے قبیلہ براہو" کی تعریف کرتے ہوئے اُسے "براہو" طائفہ کا آہنی باڑ (20) قرار دیتی ہے۔ نظم میں اُسے قریش کے شاہی نسل (21) سے قرار دیا گیا ہے اور اُس کے اجداد میر حسن (22)، میر گہرام (23) میر براہیم (24) اور میر حمزہ (25) اور عباس (26) کا تذکرہ کیا گیا ہے اور پھر کہا گیا ہے کہ ان عظیم تاریخی شخصیتوں کی پُشت سے تشکیل پایا ہوا سردار گھرانہ "براہو" کوئی معمولی اور گمنام طائفہ نہیں تھا۔

شاعر یہاں سے قصہ شروع کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ میر عمر ہر خطرے سے آزاد اور بے خوف تھا کہ اچانک اطلاع دی گئی کہ حب، سارونہ اور بیلہ سے میر چھتا جدگال کی سرکردگی میں جاموٹوں کے لشکر (27) لس سے لیکر وڈھ اور اورناچ تک براہو لوگوں کا قتل عام کرتا ہوا سوراب تک پہنچ چکے ہیں ۔جن کی مدد کو پاچ، چکو، کرخ، ہتاچی اور مولا سے شکر جام زئی کی سرکردگی

میں مزید لشکر پہنچ گئے ہیں۔ اور سوراب پر حملہ ہونے والا ہے جن کے مقابلہ کے لئے براہو لوگ میدان میں نکل پڑے ہیں۔

میر عمر براہو یہ سن کر اپنی جگہ سے اُچھل پڑا اور فوری تیار ہو کر اپنے لوگوں کے ساتھ جدگال لشکر کے ساتھ نبرد آزما ہوا، میروانی اور جدگال بڑی عصبنا کی سے کشت وغارتگری کر رہے تھے۔ عین دوران جنگ میر عمر براہو اپنے بھائی قلندر براہو کے ساتھ مارا گیا۔ جدگالوں نے میروانی قلعہ پر قبضہ کر کے غارتگری شروع کی۔ مرد قتل ہوئے اور عورتیں جان بچا کر قلعہ سے نکل بھاگیں۔

اس قیامت خیز دن کو میر عمر کا بھائی گُرگین (28) وہاں موجود نہیں تھا اور نہ کہ کوہ گرد سماعیل (29) میر عمر کا ساتھ دے سکا۔ قلندر (30) نے وقت سے پہلے اپنی جان کی قربانی دی۔ ہالہ (31) کا بزرگوار اپنے عہد سے سرخرو ہو چکا تھا۔ بجار خان کو اس کی ماں بی بی ماہناز لے کر نکل بھاگی تھی۔ جو اپنے خواجہ، رشتہ داروں کے پاس پشین چلی گئی۔

یہ داستان مہناز کو سید زادی کہتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے بجار خان کے ساتھ وہاں اٹھارہ سال تک رہی۔ جب بجار جوان ہوا تو ایک دن نہایت افسردگی سے اپنی ماں سے اپنے باپ کے قتل اور براہو طائفے اور

قبیلہ میروانی کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اُسے یہ بزدلی کی زندگی پسند نہیں ہے۔ وہ ساری زندگی شرمندگی سے نہیں گزار سکتا۔ وہ ہر حال میں اپنے باپ اور عزیزوں اور لوگوں کا انتقام جدگالوں سے لیگا۔ وہ جدگالوں کو سوراب کی سرزمین پر دندناتا ہوا نہیں چھوڑے گا۔ ان کی لاشوں کے پُشتے لگادے گا یا پھر خود بھی جان دے کر شہید ہوگا۔ وہ اس بات پر نہایت افسردہ ہے کہ اُس کے عزیز اور رشتہ دار بکھر گئے ہیں۔ احمد (32) اور مہراب (33) سیوا کے مُلک (قلات) میں ہیں۔ پہاڑوں کا باسی سماعیل پہاڑوں میں ہے مینگل (34) نوشکی کے ندی نالوں کے علاقے میں چلے گئے ہیں۔ گُرگین کو عمر خان کا ساتھ نہ دے سکنے کا افسوس ہے اور ہالہ اور ٹوہو (35) کو میرے باپ کی شہادت کے غم نے توڑ کر رکھ دیا ہے اور عزیز واقارب شکست خوردہ سے ہو گئے ہیں۔

ملک بجار کی ماں بی بی مہناز نے بیٹے کی زبان سے سب کچھ سننے کے بعد کہا کہ اپنی خنجر آبدار سجا اور سوراب کی طرف جا کر کہیں چھپ جاؤ اور اپنے باپ کے ایک وفادار غلام جس کا نام گوشو ہے اُسے تلاش کر کے اُس سے اپنا مدعا بیان کرو اور گوشو کے مشوروں پر عمل کرو (36)۔ ماہناز نے بیٹے کو گوشو کی نشانیاں بتاتے ہوئے کہا کہ اُس کے کان اور بال پہاڑی

بکرے کے کانوں اور بالوں جیسے لمبے ہیں۔قد میں وہ اپنے ہم عصروں سے زیادہ لمبا ہے۔اُس کے ہاتھوں کی چھ چھ انگلیاں ہیں۔یہ نشانیاں دیکھ کر پھر اُس سے راز و نیاز کرو۔

بجار ماں سے ہدایات لے کر چوری چھپے فقیروں اور جوگیوں کے بھیس میں سوراب پہنچا اور کہیں چھپ کر بیٹھ گیا تا کہ صبح ہوئی اور اُس نے گوشو کو بیلوں کو لئے کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا۔خوب پہچان کر بھاگتا ہوا اُس کی طرف گیا۔گوشو نے میر عمر براہو کے ملتے جلتے چہرے سے بجار کو پہچان لیا اور اُس سے روتے ہوئے لپٹ گیا اور اُسکی بلائیں لینے لگا۔

رزمیہ داستان کے مطابق گوشو، بجار کی سوراب میں آمد سے اس کا دلی مدعا سمجھ چکا تھا۔دونوں نے دلی دوستوں کی طرح مشورے کئے۔اور گوشو نے بجار کو اپنے بھائی گزین کی نگہبانی میں قریبی پہاڑیوں میں چھپایا اور اُس کے لئے خوردنوش کے اسباب مہیا کئے اور خوشی خوشی براہو رشتہ داروں کو رازداری سے بجار کی آمد اور مقصد کی اطلاع دی اور انہیں لڑائی کی تیاری کرنے پر آمادہ کیا۔جب گوشو کے ذریعہ بجار کے قریبیوں کو اطلاع ہوگئی۔تو انہوں نے تمام علاقے میں فرداً فرداً دیگر عزیزوں کو لڑنے کی منصوبہ بندی سے آگاہ کیا اور عزیزوں نے اپنے ہمدردوں اور خیر خواہوں کو

ساتھ دینے پر آمادہ کیا۔ جنگی جنون اس حد تک پھیل گیا کہ میروانی لوگوں کے علاوہ دور ونزدیک کے ہمسائے قبائل نے بجار کو مدد دینے کا وعدہ کیا اور فوراً اپنے جنگجو سوراب کی طرف بھیج دیئے۔ اور دور ونزدیک کے کاشتکار، چرواہے، ساربان، خانہ بدوش سب مسلح ہوکر سوراب میں جمع ہوگئے۔ اور شادی کا ڈرامہ رچا کر نغاڑ قلعہ کے قرب وجوار میں پہنچے اور مورچے پکڑ لئے اور جدگال کے سردار کو قلعہ سے باہر نکلنے کے آواز دی جسے یہ گمان نہیں تھا کہ جنج کی شکل اور ڈھول کی تاپ پہ رقصاں دراصل مسلح لشکر ہے۔ اُس کا ایک نمائندہ شکر نامی اپنے لوگوں کے ساتھ نکل کر لشکر کی طرف بڑھا۔ قلعہ کے بالاخانے سے جدگال سردار اس ڈرامے کو دیکھ کر بھانپ گیا تھا اور اپنے لوگوں کو بدمست شرابی کی مانند بڑی رعونت سے لڑنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ بجار نے میروانیوں کو آواز دی جو مورچوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مغرور میروانیوں نے حملے شروع کئے دونوں طرف سے دشمن اور ان کے اتحادی پہنچ رہے تھے اور ایک حشر سا برپا تھا۔ دشمن ایکدوسرے کو تہہ تیغ کر رہے تھے۔ اور کشتوں کے پشتے لگ چکے تھے۔ جدگال شکست کھا کر بیلہ اور خضدار کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ براہوطائفہ کی سرکردگی میں میروانی اور اس کے اتحادی پہلے مرحلہ میں جیت چکے تھے۔ اور بجار کے

منصوبے کے مطابق اب وہ آگے دیگر جدگالوں پر حملہ کرنے اور علاقہ سے انہیں بیدخل کرنے کی سوچ رہے تھے۔اس مرحلے کی لڑائی میں نظم کے مطابق درج ذیل اتحادی اپنے مسلح لوگوں یا لشکر کے ساتھ جدگالوں کے خلاف لڑے:-

1۔گوشو اپنے نغاڑیوں کے ساتھ۔

2۔گوشو کا بھائی گزین مع عزیز واقرباء۔

3۔سُہراب اپنے لوگوں کے ساتھ۔

4۔حاجی سوپک اپنے لشکر کے ہمراہ۔

5۔گواران اپنے لشکر کے ہمراہ۔

6۔صلاحی میروانی اپنے میروانی اتحادیوں کے ساتھ۔

7۔میران اپنے قبیلہ جلمب زئی کی لشکر کے ساتھ۔

8۔حالد کے ہمراہ اُس کے لوگ اور نغاڑیوں کا بھی لشکر تھا۔

9۔گُرگیں براہوا اپنے ساتھ لائے ہوئے لشکر کے ہمراہ۔

10۔ٹوہو براہوا اپنے حامیوں کے ساتھ۔

11۔ہالہ قلندرانی اپنے حامیوں کے ساتھ۔

ملک بجارا اپنے لشکر کے ہمراہ پوری غضنا کی کے ساتھ۔

جدگال لشکر کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔اور جدگالوں تک پہنچ کران پر حملہ آور ہوئے۔شدید اور خونخوار لڑائی ہوئی۔جس میں جدگال لاشوں کے پشتے لگ گئے۔

قتل وغارتگری کا یہ خوفناک منظر دیکھ کر گوشو سے نہ رہا گیا۔اس نے دہشت سے اپنے کان پکڑ لئے اور ہاتھ باندھ کر میروانیوں کی منت کی کہ اب قتل عام سے ہاتھ روک لو۔تم نے دشمن سے دس گنا اپنا انتقام لے لیا ہے۔دشمن کو خدا کے لئے اس بیدردی سے مت کاٹو۔اس وقت ملک بجار جذبات سے بے قابو اور دیوانگی کی حالت میں تھا اور اُس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔گوشو نے بجار خان سے التجا کی اور اُسے فتح پانے کی مبارکباد دی اور کہا کہ تم نے نغاڑ کا قلعہ دوبارہ حاصل کرلیا ہے۔

اُس نے بجار خان کو سلامت دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔کیوں کہ وہ تمام براہوی میروانوں کا تاجدار ہے،وہ ملک کا سربراہ اور قبائل کا ہیرو ہے(37)۔وہ گم گشتہ خونوں کا انتقام گیر ہے جس سے کوئی انتقام نہیں لے سکتا۔

اب گوشو اُسے مخاطب کر کے کہتا ہے کہ آؤ اور قبیلہ کی سرداری کا دستار باندھ لو،اپنے عزیزوں اور بھائی بندوں کو اکھٹا کرو۔احمد اور مہراب کو اطلاع کردو کہ جدگال کو شکست ہوگئی ہے ٹوہو اور گرگین کی وفاداری اپنی

مثل ہے ،سمائیل بزدل کو چھوڑ دو کہ لڑائی سے خوفزدہ ہو کر مار آپ کی پہاڑیوں میں جا کر چھپ گیا ہے۔

(جب پھر اطلاع آتی ہے کہ بیلہ لک کے اطراف میں جدگال نئی منصوبہ بندی کے لئے اکٹھا ہو رہے ہیں تو گوشو ملک بجار کو کہتا ہے) دیر نہ کرو اور بیلہ لک کی طرف پیش قدمی جاری رکھو اور جٹوں کو کچل ڈالو۔وہ مشورہ دیتا ہے کہ خاران کے شیر دل جنگجو ملک دوستین (38) کو بھی بلاؤ۔ گواران (39) اور سوپک (40) تیرے خیر خواہوں سے ہیں۔جو شروع دن سے میرو (41) کے وفادار رہے ہیں۔کانوں میں بالیاں پہنے والے نغاڑی جن کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے وہ تجھ پر جاں نچھاور کرنے والے ہیں۔سیاہ پھادوں نے بھی جدگالوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اب تمہارے قبیل میں ہیں۔بوٹ پہنے والے زنگی اور سہراب بھی جدگالوں سے جُدا ہو گئے ہیں۔

ملک بجار نے ہر طرف اپنے آدمی بھیجے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اتحادی حاصل کرے۔چنانچہ نال سے میروانیوں کی مدد کو حمل بیزنجو ،عمر بُزدار اور سندہ بیزنجو کی سرکردگی میں اتحادی لشکر روانہ ہوئے (42) اور جدگال لشکر سے مقابلہ ہوا جس کا سرکردہ یوسف جدگال تھا۔اس لڑائی میں جدگالوں کو

شکست ہوئی۔ میروانیوں نے گروک تک جدگالوں کا پیچھا کیا۔ جو نال، گروک اور ہزار گنجی علاقوں سے نکل بھاگے۔ بجار کے لشکریوں نے ان علاقوں پر قبضہ کیا۔ اور آگے بڑھے، معلوم ہوا کہ انہوں نے وڈھ اور اورناچ کو بھی خالی کر دیا ہے۔ براہو اتحادی ان کا پیچھا کرتے ہوئے موضع کشاری سے آگے نہیں بڑھتے۔ جدگال آگے نکل چکے ہوتے ہیں۔ ملک بجار انتہائی غضبناکی اور جوشیلی حالت میں پاگلوں کی طرح ایک ڈیڈار (درخت تھوہر) پر تلوار چلا چلا کر ٹھنڈے پڑتے ہیں۔ اس درخت کا نام زخمی ہونے کی بنا پر "ٹپی ڈیڈار" یعنی زخمی تھوہر پڑ گیا جو ابھی تک اسی نام سے معروف ہے۔ نظم کا شاعر کہتا ہے کہ پھر جنگ بندی ہوتی ہے اور یہی درخت براہو قبیلہ کی آخری سرحد تسلیم کی گئی۔ نظم میں پھر پوری حد بندی کی تفصیل دی گئی ہے جس کے مطابق بجار کے مفتوحہ علاقے "کنڑ چاری" تک تھا (43)۔ "ٹپی ڈیڈار" براہو (قبیلہ) کی سرحد ٹھہرائی گئی۔ سرحد کی سیدھ کشاری موضع تک تھی۔ اُس طرف (بیلہ کی طرف) اس کی سرحد بیلہ لک تک ہوتی تھی۔ جو حلفیہ طور پر میرو (ملک بجار کا دادا میرو میرانی) کا فتح کیا ہوا (علاقہ تھا) سچ ہے کہ حق کبھی نہ کبھی حقدار کو مل ہی جاتا ہے (44) اُس کی تلوار کے نشانات ہنگول (گاؤں) تک موجود ہیں۔ کولواہ کی طرف اُس کے مقبوضات کی سرحد

''تیرتج'' گاؤں تھا اور رتج کے سرے پر ''گوارانی دمب'' سرحد تھی۔

شاعر بتاتا ہے کہ اب فیصلہ کے مطابق اوپر (شمال) کی سمت براہو کا علاقہ اور نیچے (جنوب) کی طرف جدگال کا علاقہ تسلیم کیا گیا۔ فیصلہ اور جنگ بندی کے بعد اب اتحادیوں میں مقبوضات کی تقسیم شروع کی گئی جو اس طرح کی گئی:-

1۔ نال کی مقبوضات حمل کو دیئے گئے جسے شاعر حمل نالی یعنی نال کا رہائشی کہتا ہے اور اسے میر بجار کا نائب بتاتا ہے جسے بیس من جو (50 سیر) ماہوار بطور راشن کے ملتا ہے۔ شاعر نائب کہنے کے علاوہ اُسے میر بجار کا ''اسپ پال'' یعنی گھوڑوں کا رکھوالا بھی کہتا ہے۔

2۔ عمر بزدار کو بھیڑ بکریوں کا ریوڑ دیا گیا۔ نظم میں اُسے مقبوضات میں سے دینے کا ذکر نہیں ہے۔

3۔ ننده (حمل نالی کا بھائی تھا) کو سردار یعنی بجار کا گووال (بیل گایوں کا چرانے والا) بنایا گیا اسے بھی ملکیت دینے کا تذکرہ نہیں ہے۔

4۔ وڈھ کی مقبوضات ملک دوستین نوشیروانی کو خدمات کے عوض بطور ایک حصے کے دیئے گئے۔ گریشہ اُسے اُس کے بیٹے ملک دینار نوشیروانی کے خون کے عوضانے میں دیا گیا جو اس لڑائی میں مارے گئے تھے۔ مشکے میں گجر

گاؤں اُسے اُس کی رہائش کے لئے دیا گیا۔

5۔تیمر ولد یوسف ہوتک کو باراں لک سے درا کالہ اور پھروڈھ سے وہیر تک کی مقبوضات کا نائب بنایا گیا۔

6۔سُہراب جت کو جیوا کے نصف علاقے سے لے کر سوراب ندی تک ،پارکو کے آب جُو سے لے کر حرما گئے تک کے درمیانی مقبوضات میں سے حصہ دیا گیا۔

7۔نوجوان محراب کو علاقہ کرخ ،چکو، زیدی تا حدّ باغبانہ خدمات کے عوض دیا گیا۔

8۔مستونگ کے کھڈ کوچہ سے لے کر خضدار قلعے تک کا درمیانی علاقہ احمد اور کمبر کو مشترکہ طور پر دیا گیا۔

9۔''گیژ دغان تا حد خلکنا کھڈ''، لاکوریاں کی زمین اور چھڈ (واقع گدر) کا بالائی حصہ، جیبری کاریز تا حد گذرگاہ جوری، خیسن دون اور دشت بڈو کی مقبوضات گُرگین اور دُرک کو دیئے گئے۔نیز گُرگین کو اُس کے نئے قبیلہ کی سرداری بھی دی گئی۔

10۔سماعیل کو کچھ بھی نہیں ملا کیونکہ اُس نے جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔

11۔ہالہ اور ٹوہو کو ان کے باپ کے خون کے عوض نے اور اُن کے دونوں

بیٹوں کی جنگی خدمات کے صلہ میں درج ذیل ملکیتیں دی گئیں:۔

زیارت گاہوں سے نصف تُوتک تک ،روشن آپ سے جیبری زِک تک ،جوئے میران سے گُرگٹ تک ، گبر ریک سے سلام بیک (خاران کے علاقے) تک، جھلاوان (خاران) سے ریگ واشک تک۔

12۔شاہ بیک (ایلتازئی ،جدّ قبیلہ شاہ بیک زئی) کوسراوان (خاران) کا علاقہ دیا گیا۔

13۔سرمہ سنگ سے مارآپ کی پہاڑیوں تک ،دشت گوران سے سرحد چھاتی تک مینگلوں کو دیا گیا۔یہ حصہ مینگلوں کو میروانیوں کے ساتھ رشتوں کی ازسرنوتجدید کے عوض اضافی طور پر دیا گیا(46)۔

14۔حاجی سوپک (47) کو ان کی جنگی خدمات کے عوض خاران سے کاسنگ ندی اورلوپ تک جائیدادیں دی گئیں۔

15۔گواران (48) کو جو ملکیتیں دی گئیں وہ آبِ مولی سے کوہ سیاہ گری تک اورترندیں ندی کے آخری جوئے آب تک تھیں۔

16۔صلاحی (49) کو''گوئندان'' اورزرک کومٹ کی مقبوضات دی گئیں (50)۔

17۔حالد (51) کونصف تُوتک سے کوہ گاجی تک اور ہوکانی کا پچھلا علاقہ

دیا گیا۔

18۔آدم کوگدر میں علاقہ سُہر چیل دیا گیا۔

19۔میران کولاکوریان میں زمین اور ایک کاریز اور کلغلی ٹیلہ سے نیلی بیل تک کی مقبوضات دی گئیں۔

20۔دمب مار آپ سے انارتر کی تک کا علاقہ زیرک کو دیا گیا۔

21۔گوشو(52) کوسرحد ڈن سے تُوتک کے درمیان اراضیات اور نغاڑ کا آب جُو دیا گیا۔

22۔گوشو اور گزین کو پھر مشترکہ طور پر جو اراضیات دی گئیں وہ سنگ سُوراب سے زنگی گٹ تک ،انجیرہ ندی سے زہری وادی تک اور کونڈاری بند تک کے درمیانی علاقے میں واقع تھیں۔

مقبوضات کی تقسیم کے بعد منظوم داستان کے مطابق میر بجار نے اعلان کیا کہ گوشو کے بھائی بند اور رشتہ دار وغیرہ آج سے میر دانیوں کی غلامی سے آزاد ہیں۔اور میر بجار آج سے براہو اور اس کے اتحادیوں کا سردار ہے۔درج ذیل علاقے حلفیہ طور پر اُس کے مفتوحہ ہیں:۔

☆کھڈ مستونگ (کھڈ کوچہ) سے مند حاجی تک،

☆مند حاجی سے روشن آپ تک،

☆ روشن آپ سے سر آپ تک،

☆ اواران سے عالی کنور تک،

☆ جاہواور جنگول سے کشاری تک،

☆ بجار نے بیلہ سے بھی مالیہ وصول کیا ہے۔

آخر میں نظم کا شاعر حلفاً کہتا ہے کہ مذکورہ جاگیریں براہو اتحادیوں کی فتوحات ہیں اور جن اتحادیوں میں تقسیم کی گئی ہیں اُن کے پاس پہلے یہ ملکیتیں نہیں تھیں پھر کہتا ہے کہ جو کچھ اُس نے بیان کیا ہے ان کی سچائی ثابت کرنے کے لئے وہ قرآن پر بھی حلف لینے کے لئے تیار ہے۔

براہوئی تاریخ کا واحد ماخذ:۔

براہو جدگال جنگ کی یہ منظوم داستان، براہوئی تاریخ کا واحد ماخذ ہے۔جس نے براہوئی تاریخ کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے تمام تر فرضی کہانیوں پر سیاہی پھیر دی ہے۔جنہیں براہوئی تاریخ کا نام دیا گیا ہے۔اس سلسلے میں منظوم داستان سب سے پہلے ہمیں لفظ ''براہو'' سے متعارف کراتی ہے۔

براہو:۔

یہ منظوم داستان ہمیں بتاتی ہے کہ براہو، میروانی قبیلہ کا سردار گھرانہ ہے جو سوراب کے موضع نغاڑ میں میروانی قلعہ میں رہائش پذیر ہے ۔اورڈن سے سوراب تک کا خطہ اس طائفہ کی ملکیت ہے جو اُس کے تصرف میں تھا۔ یہ خطہ براہو مُلک کہلاتا تھا۔ مرکزی طائفہ تمام میروانی قبیلہ پر بالادستی رکھتا تھا۔ براہو گھرانے کا سربراہ میروانی قبیلہ کا سردار ہوتا تھا۔ نظم ہی سے پتہ چلتا ہے کہ براہو طائفہ کا جدامجد میر براہیم تھا۔ جو عُرف عام میں براہو مشہور تھا۔ اُس کا گھرانہ اُس کی نسبت سے براہو مشہور ہوا۔ جو میروانی قبیلہ کا مرکزی طائفہ تھا۔ براہو طائفہ کے جن دیگر اجداد کا ذکر کیا گیا ہے ان میں میر گہرام، میر حسن اور میر کمبر کے نام شامل ہیں جو اپنے وقت کی مشہور شخصیتیں تھیں ۔خوانین قلات کے تذکرہ نویس آخوند محمد صدیق نے اپنی فارسی تصنیف ''تاریخ الابرار'' میں خوانین قلات کا جو شجرہ نسب دیا ہے اُس میں میر حسن کو میر گہرام کا بیٹا اور میر گہرام کو میر ابراہیم کا بیٹا دکھایا گیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ شخصیتیں پنجگور کے رئیس قبیلہ سے ہیں جن کا سلسلہ نسب اکثر بلوچ قبائل کی روایتی شخصیت ''میر حمزہ'' تک پہنچتا ہے

جنہیں اکثر بلوچ غلط فہمی میں نبی کریمؐ کا عم "امیر حمزہ" سمجھتے ہیں اور قریش ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جن کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اس نظم میں "براہو" طائفہ اور اس کی تاریخی شخصیتوں کو میر حمزہ کی نسل سے بتا کر قریشی ہونے کی بات کی گئی ہے۔ جسے رند قبائل نے بھی اپنی قدیم شاعری میں اپنا جدامجد بتایا ہے جبکہ کسی رند طائفہ یا شخصیت کا شجرہ نسب کسی میر حمزہ نامی شخص تک نہیں پہنچتا۔ اس کے برعکس میروانی اور اس کے ہم نسل قبائل کے شجرہائے نسب "میر حمزہ" تک موجود ہیں۔ جو مکران کے رئیس قبیلہ کی ایک مشہور تاریخی شخصیت گذری ہے۔ درحقیقت نظم کا شاعر اور اکثر بلوچ قبیلے نام "میر حمزہ" اور "امیر حمزہ" میں فرق نہیں کر سکے ہیں اور یہ غلط فہمی بھی اسی سبب سے پیدا ہوئی ہے۔

میر حسن:-

رزمیہ داستان میں میر حسن کو میروانیوں کے اجداد سے کہا گیا ہے۔ جو میر گہرام کا بیٹا اور میر براہیم کا نواسہ ہے۔ اُسے کمبرزئیوں سے کہا گیا ہے۔ واضح ہو کہ کمبرزئی قبیلہ "فاتح قلات میر کمبر رئیس بور سوار" کے نام پر ہے وہی کمبرزئیوں کے جدامجد ہیں یہ پنجگور کے قبیلہ رئیس سے تھے۔ میر گہرام

،میر حسن اور میر براہیم وغیرہ اپنے وقت میں رئیس کہلاتے تھے۔میر حسن ایک نڈر اور شمشیر زن سردار تھا۔جس نے کئی جنگی مہمیں سر کیں اور ان میں شمشیر زنی کے جوہر دکھائے۔آخوند محمد صدیق نے اُنہیں پہلا خان قلات بتایا ہے اور لکھا ہے کہ دہواروں نے قلات کے ایک مغل حاکم کو اس کے ظالم ہونے کی بنا پر مار دیا اور اپنے میں حکمرانی کے جوہر نہ پا کر معتبریں کو میر براہیم خان کے پاس بھیجا تا کہ وہ اپنا کوئی بیٹا حکمرانی کے لئے نامزد کریں ۔میر براہیم خان نے اپنے نواسہ اور گہرام کے بیٹے میر حسن کو دہواروں کے ساتھ قلات بھیجا اور اُسے حکومت کی گدی پر بٹھایا(53)۔گل خان نصیر نے ''تاریخ بلوچستان'' کے صفحہ 14 اور خان میر احمد یار خان بلوچ نے ''مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ'' کے صفحہ 36 پر لکھا ہے کہ میر حسن لاولد فوت ہوئے لیکن آخوند محمد صدیق نے خوانین قلات کا جو شجرہ نسب اپنی کتاب ''تاریخ الابرار'' میں شائع کیا ہے میں اُس میر حسن کا ایک بیٹا ''سنجر '' کا نام دیا ہوا ہے۔اور مشکے کے میروانی سردار قادر بخش نے میر حسن کے چھ بیٹوں کے نام گنائے جو میرو خان، سنجر خان، کمبر خان، احمد خان، براہیم خان اور شنبہ خان تھے جو میروزئی کہلاتے تھے۔

میرو براہو میروانی:-

براہو جدگال جنگ کی رزمیہ داستان نے میرو براہو میروانی کا تذکرہ حاکم نغاڑ اور میروانی سردار میر عمر کے باپ کے طور پر کیا ہے۔اور چند اشاروں کنایوں میں ان کے بارے میں قدرے معلومات دی ہیں۔انہیں میر عمر سے قبل میروانیوں کا ایک لڑاکو سردار اور فاتح دکھایا گیا ہے۔جس کی فتوحات کولواہ سے بیلہ لک اور ہنگول گاؤں تک پھیلی ہوئی تھیں۔نظم ہمیں بتا دیتی ہے کہ جو علاقے میر بجار کی سربراہی میں براہو اتحادیوں نے فتح کیے ہیں وہ دراصل پہلے ہی میرو کے فتح کیے ہوئے علاقے تھے جو شاید بعد میں کسی وقت پھر جدگالوں کے قبضے میں جا چکے تھے۔(54)۔

میر عمر براہو میروانی:-

میرو براہو کے بعد نظم ہمیں اُس کے بیٹے میر عمر براہو سے ملاقات کراتی ہے جو میروانیوں کا سردار اور قلعہ نغاڑ کا حاکم ہے۔اسی کے دوَر میں کچھی، بیلہ اور جہلاوان کے جدگال لشکر قلعہ نغاڑ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔میر عمر اپنے لوگوں کے ساتھ جدگال لشکر سے مقابلہ کرتا ہے لیکن اچانک اور ناگہانی حملے

کی تاب نہ لاکر اپنے بھائی قلندر براہو کے ساتھ قتل ہو جاتا ہے اور علاقہ جدگال کے قبضے میں چلا جاتا ہے اور قلعہ نغاڑ پر جدگال قابض ہو جاتے ہیں۔(55)۔

میر بجار براہو میروانی:-

براہو جدگال جنگ کی رزمیہ داستان ہمیں میر بجار کی مختصر سوانح عمری بتا دیتی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ میر بجار،سوراب کے موضع نغاڑ کے میروانی قلعے میں میر عمر براہو میروانی کے ہاں تولد ہوا جسکی پیدائش پر بڑی خوشیاں منائی گئیں اور خیرات وصدقات تقسیم کیے گئے۔اُسے بڑے ناز ونعم سے پالا گیا۔اُسے قرآن معہ ترجمہ وتفسیر پڑھانے کے لئے اتالیق مقرر کئے گئے۔یہ زمانہ میروانی حاکمی اور علاقے کی خوشحالی اور بےغمی کے دن تھے کہ ناگہاں بیلہ،مولا،کرخ وچھی کے علاقوں سے جدگال لشکر نے قلعہ نغاڑ پرحملہ کیا براہولوگوں نے مقابلہ کیا۔حاکم نغاڑ میر عمر اپنے بھائی قلندر کے ساتھ قتل ہوا اور میر عمر کی بیوی بی بی ماہناز اپنے کمسن بیٹے بجار کو لے کر علاقے سے نکل گئی اور اپنے خواجہ رشتہ داروں کے پاس پشین پہنچ گئی۔وہیں پر بجار بڑا ہوا اور جوانی کو پہنچا۔رزمیہ داستان کا شاعر پشین میں بجار کے

رہنے کا عرصہ اٹھارہ سال بتاتا ہے۔اس دوران بجار نے اپنی ماں سے اجازت طلب کی تا کہ سوراب جا کر اپنے باپ اور قبیلہ کے جدگال قاتلوں سے انتقام لے سکے۔ماں نے اُسے اجازت دی اور سوراب میں اپنے خاندانی غلام گوشو کے پاس جانے کا اُسے مشورہ دیا۔میر بجار چھپتے چھپاتے سوراب پہنچا۔اور گوشو کے ساتھ جدگالوں سے لڑنے کی منصوبہ بندی کی اور لڑائی شروع کی ۔یہ لڑائی کئی عرصے تک سوراب،خاران،خضدار،نال ،گروک،اور ناچ اور وڈھ وغیرہ میں چلتی رہی تا کہ جدگالوں کو شکست دے کر میر بجار براہو کے اتحادیوں نے جدگالوں کو بیلہ کے موضع کشاری سے آگے دھکیلا۔دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ بندی اور علاقے کی حد بندی ہوگئی۔تب بجار مفتوحہ علاقے کی مقبوضہ اراضیات کو براہوا تحادیوں میں تقسیم کیا۔اور اتحادیوں کے سرکردہ شخصیتوں کے ناموں کی نسبت سے نئے قبیلوں کی۔تشکیل کی اور ان کے سرکردہ اشخاص کی بحیثیت سردار دستار بندی کی نئے قبائل نے متفقہ طور پر میر بجار کو براہوا تحادیہ (براہوئی) کا چیف بنایا اور ہر قبیلہ کے سردار نے اُس کو دستار باندھا۔قلعہ نغاڑ دوبارہ میر عمر براہو کے بیٹے میر بجار کے قبضے میں آچکا تھا جو اتحادیہ ''براہوئی'' کا مرکز ٹھہرا۔

براہو جدگال جنگ:-

میروانی قبیلے کی اہم شخصیتوں سے متعارف کرانے کے بعد یہ منظوم داستان براہو میروانیواں اور جدگال (57) قبائل کے درمیان لڑائی کا تذکرہ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ جن اراضیات ومقبوضات پر میروانیوں کا تصرف ہے اُن پر جدگال قبائل کا دعوی چلا آ رہا تھا۔لیکن دراصل یہ مقبوضات بنیادی طور پر میروانیوں کے رہے ہیں ۔اور ان پر میروانی قبیلہ کے میروخان اول اُس کے بھائی سنجر نے کئی دفعہ جدگالوں سے جنگیں لڑی ہیں ۔اور کولواہ سے ہنگول اور بیلہ تک میرو کی مقبوضات رہی ہیں جن پر بعد میں جدگال قبائل کے قبیلہ بلفت (58)اور اس کی شاخوں نے قبضے کئے ۔سوراب کے میروانی سردار میر عمر براہو نے دوبارہ ان اراضیات کو چھڑانے کے لئے جدگالوں سے لڑائی مول لی تھی ۔جس کے بدلے جدگالوں نے مختلف علاقوں سے لشکروں کی جمع آوری کی اور اچانک میروانی قلعہ نغاڑ پر دھاوا بول دیا۔میر عمر براہو چند موجود لوگوں کے ہمراہ مقابلہ پر نکل پڑا اور لڑتے ہوئے اپنے بھائی قلندر براہو کے ساتھ جان دیدی۔اُس کی بیوی بی بی ماہناز اپنے کم سن بچے بجار کو لے کر اپنے رشتہ داروں کے پاس پشنگ

(پشین) چلی گئی۔ وہ خواجہ سیدّوں سے تھی جو وہاں اٹھارہ سال تک رہی
(59) جدگالوں نے قلعہ نغاڑ پر قبضہ کیا اور خصوصی طور پر براہو میروانیوں کا
قتل عام کیا اور علاقے پر اپنی بالادستی قائم کی۔ یہ تاریخی نظم ہمیں بتاتی ہے
کہ کھڈ کوچہ سے لے کر خضدار، وڈھ، نال، اور ناچ تا حد بیلہ اور خاران کے
ریگستانوں سے لے کر مولا، کرخ تا حد کچھی جگہ جگہ جدگال قبائل کی آبادیاں
تھیں جہاں سے انہوں نے لشکروں کی جمع آوری کر کے سوراب پر حملہ کیا
تھا۔

بی بی مہناز اٹھارہ سال تک، میر بجار کی نگہداشت اور پرورش کرتی
رہی اور اُسے ایک منتقم بلوچ ماں کی طرح اپنے جدگال دشمنوں سے اپنے
باپ اور عزیزوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے تیار کیا۔ اسی تربیت کے نتیجے
میں ایک دن بجار نے اپنی ماں سے سوراب جانے کی اجازت چاہی تا کہ
اپنے دشمنوں کا پتا چلا کر اُن سے دو دو ہاتھ کرنے کی تیاری کرے۔ ماں نے
اُسے مسلح کر کے سوراب میں اپنے خاندانی غلام گوشو کے پاس جانے کی
ہدایت کی اور اُسے گوشو کی خاص نشانیاں بتا دیں۔ ملک بجار سوراب پہنچا اور
گوشو کو ڈھونڈ نکالا اور اُسے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ گوشو نے بڑی
رازداری اور ہشیاری سے بجار کے عزیز واقربا اور میروانی معتبرین سے

رابطہ کیا اور ہمسایہ قبائل سے امدادی لشکر تیار کرانے اور انہیں براہو میروانیوں کی مدد پر آمادہ کیا۔تب منظم طریقے سے جدگال آبادیوں پر بھرپو رحملے کے منصوبے بنائے اور پہلا حملہ قلعہ نغاڑ پر حملے سے کیا۔جس میں جدگال سنبھلے نہ پائے اور گھروں کے گھر مقتول ہوئے۔تب وہ گھر بار چھوڑ چھاڑ کر بیلہ اور کچھی کے اطراف بھاگنے لگے۔میر بجار نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا اور نئے اتحادیوں کو بھی ساتھ ملاتا گیا قرب وجوار کے علاقوں میں جہاں جہاں جدگالوں کی آبادیاں تھیں ان پر حملے کئے گئے اس طرح قلات ،سوراب ،خاران ،رخشان ،زہری، مولا ،خضدار ،وڈھ ،گریشہ،نال ،مشکے اور ناچ تا حد پورالی یہ لڑائی گھر گھر اور پہاڑ پہاڑ چھڑ گئی تاوقتیکہ جدگالوں نے شکست کھا کر جنگ بندی کر لی اور دونوں فریقوں میں علاقے کی حد بندی ہوگئی۔ دوران جنگ کئی جدگال گھرانے ،اپنے قبیلہ سے جُدا ہوکر براہو میروانیوں سے آملے اور اپنی زیر تصرف مقبوضات کو بچا لیا۔مذکورہ رزمیہ داستان میں ان سرکردہ لوگوں اور ان کے اتحادیوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

براہوا تحادیہ کے ارکان:-

براہو جدگال جنگ کی رزمیہ داستان ہمیں جدگال کے خلاف لڑنے والے براہو میروانی طائفے کے جنگی اتحادی لشکروں کے کمانداروں یا سرکردہ اشخاص کی پوری فہرست مہیا کرتی ہے جو درج ذیل تھے:

1۔قلندر.....قبیلہ کے براہو میروانی تھے۔

2۔گُرگین.....قبیلہ کے براہو میروانی تھے۔

3۔سُماعیل.....قبیلہ کے ذگر تھے۔ابتدائے جنگ میں اتحادی تھے۔

4۔ہالہ.....قلندر براہو کے بیٹے تھے۔

5۔ٹوہو.....قلندر براہو کے بیٹے تھے۔

6۔گوشو.....نغاڑی نقیب تھے۔میروانی غلاموں سے تھے۔

7۔گزین.....گوشو کے بھائی تھے۔

8۔میر احمد.....قبیلہ کے ایلتازئی رئیس تھے۔معزول خوانین کے شاہزادوں سے تھے۔

9۔میر مہراب.....میر احمد ایلتازئی کے بیٹے تھے۔

10۔سُہراب جت.....قبیلہ کا سیاہ پھادتھا۔

11۔زنگی.....سُہراب کا بھائی تھا۔

12۔حاجی سوپک.....ساسولی بُلفت تھا۔بلفت جدگالوں سے کٹ چکا تھا۔

13۔گواراں.....ساسولی بلُفت تھا۔جدّگالوں سے کٹ چکا تھا۔

14۔صلاحی.....میروانی تھا۔سردارخیل براہوطائفہ سے نہیں تھا۔ میروانی اسے سرمستانی بتاتے ہیں۔

15۔میران.....جلمب زئی قبیلے سے تھا۔

16۔حالد.....میروانی تھا۔سردارخیل براہوطائفہ سے نہیں تھا۔

17۔ملک دوستین.....قبیلہ نوشیروانی سے تھا۔اپنے بیٹے ملک دینار کوساتھ لایا تھا۔

18۔حمل.....بیزنجو(نسلاً جدگال)قبیلہ سے تھا۔جدگالوں سے کٹ چکا تھا۔علاقے پرنوحانیوں کی بالادستی کی بناپر بیزنجونوحانی کہلاتا تھا۔

19۔عمر.....بیزنجوقبیلہ سے روایت کیا جاتا ہےلیکن اُس کا موجودہ گھرانہ بیزنجوہونے سے انکاری ہےاوراپنے کو نصیرآباد کےنُوحانی عمرانیوں سے بتاتا ہے۔جورندہونے

کے دعویدار ہیں۔ بیز نجو لشکر میں تھا۔

20۔ نندہ..... بیز نجو (نسلاً بُلفت جدگال) قبیلہ سے تھا۔ اور حمل بیز نجو کا بھائی تھا۔

21۔ تیمرُ..... ہوتک (رخشانی غلزئی) قبیلہ سے تھا۔ نوشیروانی کا نائب تھا۔

22۔ کمبر..... کہدائی قبیلہ سے تھا۔ ایلتازئیوں کا داماد تھا۔

23۔ شاہ بیگ..... ایلتازئی رئیس قبیلہ سے تھا۔ کمبر کہدائی کی کمان میں لڑا۔

24۔ زرک..... قبیلہ رئیس توک سے تھا۔ ہڈ پروشی (رشتہ توڑ کر) کر کے مستونگ کے زرخیلوں میں شامل ہو چکا تھا۔ اُس کے ہم نسل ''ایلتازئی'' اُسے اتحادی بننے پر آمادہ کر چکے تھے۔

25۔ دُرک..... قبیلہ رئیس توک سے تھا۔ لیکن قبیلہ سے ناراض تھا۔

26۔ آدم..... قبیلہ موسیانی زہریوں سے تھا۔

27۔ زیرک..... قبیلہ محمد حسنی سے تھا۔

ان سرکردہ جنگجوؤں کے ساتھ ان کے اتحادی اور لشکر تھے۔ جن کا لشکر محض ان کے گھرانے کے افراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ زئی کہلاتا تھا۔ یعنی خاندان کی نشاندہی کرتا تھا تو اُس جنگجو کے نام سے نیا قبیلہ ''زئی'' کے

لاحقہ کے ساتھ تشکیل پایا اور جس جنگجو کے ہمراہ اپنے اور دیگر باہر کے اتحادی بھی ہوتے تھے تو بلوچی قبائلی نظام کے تحت اُس کے نام سے ''آنی'' کے لاحقہ کے ساتھ نیا قبیلہ تشکیل پایا۔ آنی کے لاحقہ والا قبیلہ ''کنفیڈریشن'' کی علامت ہوتا ہے۔اس طرح براہو میروانی قبیلہ کے مندرج بالا جنگجو اتحادیوں کے نام سے درج ذیل نئے قبیلے تشکیل پائے:

1۔ قلندر براہو کے نام سے ''قلندرانی'' قبیلہ۔جدگالی کے زیر اثر ''قلندراڑی'' بھی کہلاتا ہے۔

2۔ گُرگین براہو کے نام سے ''گرگینانی'' قبیلہ۔جدگالی کے زیر اثر گُرگناڑی کہلاتا ہے۔

3۔ سُماعیل ذگر کے نام سے ''سماعیلانی'' قبیلہ۔جدگالی کے زیر اثر ''سُمالاڑی'' کہلاتا ہے۔جہاں جدگالی کا اثر نہیں تھا وہاں ''سمالانی'' کہلایا۔

4۔ہالہ۔قلندر براہو کی نسبت سے ''قلندرانی'' کہلایا۔اُس کے نام سے خاندانی طائفہ ''ہالہ زئی'' وجود میں آیا۔

5۔ٹوہو۔قلندر براہو کی نسبت سے ''قلندرانی'' کہلایا۔اپنے بھائی ''ہالہ'' کے ساتھ تھا۔ان کے نام سے طائفہ نہیں بنا۔

6۔ گوشو۔ نغاڑی قبیلہ سے تھے۔ اُس کے نام سے نیا قبیلہ نہیں بنا۔ روایت ہے کہ جنگ کے بعد اس کے گھرانے کے لوگ اُس کے اصل نام ''جامک'' کی نسبت سے ''جامک زئی'' کہلائے۔ اب نغاڑیوں میں جامک زئی'' طائفہ موجود ہے۔

7۔ گزین۔ گوشو کا بھائی تھا۔ ان کے نام سے بھی کوئی طائفہ نہیں بنا۔

8۔ میر احمد ایلتا زئی رئیس کے نام کی نسبت سے نیا قبیلہ ''احمد زئی رئیس'' تشکیل پا گیا۔ جو 1666ء سے خوانین قلات کا نیا قبیلہ بنا اور ایلتا زئی کا نام پسماندگان کے لئے بچ گیا۔

9۔ سُہراب جت کے نام سے دوران جنگ اور آخر جنگ کوئی قبیلہ یا طائفہ نہیں بنا۔ تاہم سیاہ پھادوں میں کچھ عرصے تک ''سہراب زئی'' کا نام سُنا گیا ہے۔

11۔ زنگی سیاہ پھاد کے نام سے زنگیانی قبیلہ بنا۔ یہ قبائلی کنفیڈریشن آخر جنگ ٹوٹ گیا۔ اور زنگی کا خاندان جدگالی زبان کی بندش میں ''زنگیجو'' کہلایا

12۔ حاجی سوپک کے ساتھ چند لوگ اُس کے گھر ہی کے تھے۔ اس لئے وہ حاجی کے نام کی نسبت سے ''سوپک'' ہی کہلائے اور سوپک ہی ان

کا طائفہ بنا۔

13۔ گواراں ساسولی (بلفت جدگال) کے نام سے جدگالی بندش میں قبیلہ ''گوارانجو'' تشکیل پا گیا۔

14۔ صلاحی میروانی کے نام سے محدود طائفہ ''صلاحی'' بنا۔

15۔ میران جلمب زئی کے نام سے میران زئی قبیلہ بنا۔ ساجدیوں میں شمار کیا گیا ہے۔

16۔ حالد میروانی کے اتحادی چندگھر کے افراد اور نغاڑیوں کے ایک لشکر پر مشتمل تھے۔ لیکن اُس نے مخلوط قبیلہ پسند نہ کرنے کی بنا پر کنفیڈریشن تشکیل نہیں کی اور محدود طائفہ اُس کے نام سے ''حالد'' بنا۔

17۔ ملک دوستین نوشیروانی کے نام سے کوئی قبیلہ نہیں بنا۔

18۔ حمل بیزنجو، جو نوحانی کنفیڈریشن کی نسبت سے نوحانی بھی کہلاتا تھا، کے نام سے ''حملانی'' قبیلہ تشکیل پا گیا۔ جو حملانی بیزنجو کہلایا۔

19۔ عمر بُزدار کے نام سے عمرانی قبیلہ تشکیل پایا۔ چونکہ بیزنجو لشکر کی سرکردگی میں جنگ میں حصہ لیا تھا اس لئے عمرانی بیزنجو'' کہلایا۔

20۔ نندہ بیزنجو کے نام سے قبیلہ ''نندوانی'' تشکیل پا گیا۔ (نندوَ'' نندہ کی جدگالی ادائیگی ہے۔ جدگالی اور سندھی میں جمع یا اجتماعی نام کے

ساتھ ''ہ'' لگتا ہے لیکن اگر یہ نام واحد شخص کے لئے بولا جائے تو پھر ''ہ'' کی جگہ ''و'' استعمال کیا جاتا ہے۔ جو ایک شخص کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً قوم کے نام کے لئے ،سمہ ،سومرہ ،انگاریا ،بُرہ ،سہتہ ،روجھہ ،بیزنجہ ،صابرہ ،موندرہ ،وغیرہ بولا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ نام ایک شخص کے نام کے ساتھ لگایا جائے تو پھر یہ نام سمو ،سومرو ،انگاریو ،بُرو ،سہتو ،روجھو ،بیزنجو ،صابرو اور موندرو بولا جائیگا۔)

21۔ تیُمر ہوتک رخشانی کے نام سے قبیلہ ''تیُمرانی'' تشکیل پا گیا۔ جو ''جدگالی'' لہجے کے زیر اثر ''تمبر اڑی'' کہلایا۔ بلوچی کے زیر اثر یہ نام تمبرانی کہلاتا ہے۔

22۔ کمبر کہدائی کے نام سے قبیلہ ''کمبرانی'' تشکیل پا گیا۔ یہ نام بلوچی اور جدگالی کے زیر اثر بالترتیب ''کمبرانی'' اور کمبر اڑی'' کہلاتا ہے۔

23۔ شاہ بیگ ایلتازئی کے ساتھ اُس کے گھرانے کے اتحادی تھے اس لئے اُس کے نام سے صرف شاہ بیگ زئی طائفہ بنا۔ چونکہ شاہ بیگ زئی، کمبر کہدائی کے زیر کمان لڑے تھے اس لئے یہ طائفہ ''کمبرانی'' بھی کہلایا اسی نسبت سے احمد زئی ایلتازئی ''کمبرانی'' کہلاتے ہیں۔

24۔ زرک رئیس توک کے نام سے اُس کے لوگ زرّک زئی طائفہ بنے۔

25۔ذرک رئیس توک کے نام سے آخر جنگ تک کوئی قبیلہ نہیں بنا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ''ذرک زئی'' طائفہ کا نام سنا گیا۔ جو اپنے پدری قبیلہ۔ رئیس سے ناراض اور بچھڑ گیا تھا۔

26۔آدم موسیانی زہری کے نام سے قبیلہ ''آدمانی'' بنا۔

27۔زیرک محمد حسنی کے نام سے قبیلہ ''زیرکانی'' تشکیل پا گیا۔

براہوئی:۔

مذکورہ رزمیہ داستان بتاتی ہے کہ براہو جدگال جنگ کے دوران اور اس کے اختتام تک براہو میروانی طائفہ کے اٹھائیس سرکردہ جنگجو اتحادیوں میں سے بائیس جنگجوؤں کے ناموں سے بائیس قبیلے وجود میں آئے۔ جو براہو کے اتحادی ہونے کی نسبت سے نئے قبائلی نام ''براہوئی'' سے شہرت پا گئے ۔یہی بنیادی قبیلے جو صرف براہو جدگال جنگ کی پیداوار تھے اور اُن کے جدامجدوں کا تعلق مختلف الاصل قبیلوں سے تھا اصلی براہوئی ہیں جن میں مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کی گئی اور وہ آج تک اُسی تقسیم کے مطابق اپنے زیر تصرف املاک کے مالک ہیں۔ مذکورہ بائیس قبیلے یہ ہیں:

1۔قلندرانی 2۔گرگناڑی 3۔سُمالانی

4۔ہالہ زئی 5۔احمد زئی 6۔زنگیانی

7۔سوپک 8۔گوارانجو 9۔صلاحی

10۔میران زئی 11۔حالدانی 12۔حملانی

13۔عمرانی 14۔نندوانی 15۔تمبراڑی

16۔کمبرانی 17۔شاہ بیگ زئی 18۔زرک زئی

19۔درّک زئی 20۔نغاڑی 21۔آدمانی

22۔زیرکانی

اشاریہ:-

1۔بلوچستان، تاریخ کے آئینے میں صفحہ 226 صفحہ 227۔

2۔''جدگال'' کوئی نسلی اصطلاح نہیں ہے۔اور نہ کوئی خاص قبیلہ ہے۔بلکہ یہ ایک لسانی اصطلاح ہے جو ایک لسانی گروہ کی شناخت کے لئے مروج ہوا ہے۔جس میں مختلف الاصل طائفے شامل ہیں۔بلوچ قومداری نظام میں ان لوگوں یا گروہوں کے لیے لسانی اصطلاح استعمال کی جاتی رہی ہے ۔جن کی نسل تو بلوچ ہے لیکن ان کی زبان بدل گئی ہے اور انہوں نے کسی غیر بلوچ کی زبان اپنالی ہے۔تاکہ یہ پہچان رہے کہ ان گروہوں یا طائفوں کی

نسل غیر بلوچ نہیں ہے۔ وہ بلوچ ملت ہی سے متعلق ہیں لیکن ان کی زبان غیر بلوچوں کی ہے۔ بنیادی جدگال طائفہ کا اصلی اور قدیمی وطن مغربی بلوچستان کا علاقہ دشتیاری رہا ہے جہاں پر اس کی تشکیل ہوئی۔ اور پھر اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اور ان کی نسل پھیلتی گئی۔ اور ان میں نو وارد بھی داخل ہو تے گئے۔ تب یہ ایک بڑا قبیلہ بن گیا۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ پھر زبان کی تخصیص بھی ختم ہوگئی۔ اور اس کی حیثیت ایک کنفیڈریشن کی بن گئی۔ بنیادی طائفہ جو علاقے کی نسبت سے دشتیاری کہلاتا تھا۔ اپنے کو نسلاً ہو ت بلوچ کہلاتا رہا ہے۔ جو بعد میں وسیع ہو کر ایک نسل نہیں رہا۔

دشتیاری خود اپنے قبیلائی نام ''جدگال'' کی تاریخی پیرائے میں وضاحت یوں کرتے ہیں:۔

> ''دشتیاری بلوچوں کے ایک گھرانے کے کچھ افراد نے اپنے دو عزیزوں کا قتل کیا۔ خاندان میں سخت کشیدگی پھیلنے کے بعد چار افراد جو براہ راست قتل میں ملوث تھے علاقہ چھوڑ کر کراچی کے ملیر چلے آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔

یہاں پر ان کے پیچھے اور بھی کئی لوگ
آ کر مل گئے۔ کچھ عرصہ بعد یہ لوگ اندرون
سندھ منتقل ہو گئے ۔اور بھکر کے
قریب مقیم ہو گئے ۔ان دنوں بھکر
اور گردنواح پر سومرہ قوم حاکم تھا۔
جن کا سردار خفیف سومرہ تھا ۔سومروں
کے خلاف سوڈھا، جاریجہ اور ہندو راجپوتوں
نے علم بغاوت بلند کیا ہوا تھا ۔اور علاقہ
میں کافی شورش بر پا تھا ۔خفیف نے
دشتیاری گروہ کے پاس آدمی بھیجے
اور ان کو پیغام دیا کہ تم بلوچ لوگ
بہادر اور وفادار ہو ۔میں نے تمہیں
اپنی ہمسائیگی میں اسی لئے قبول کیا تھا۔
مجھے امید رکھنی چاہیے کہ تم لوگ میرے
خلاف باغیوں کا ساتھ نہیں دو گے
اور نہ انہیں کبھی پناہ دو گے ۔

ان دشتیاری بلوچوں نے اس چیز
کا وعدہ کیا ۔جب باغیوں نے دیکھا
کہ دشتیاری خفیف سومرہ کے
حامی اور ساتھی بن چکے ہیں تو انہوں
نے کچھ سمہ لوگوں کے ذریعہ بلوچوں
کے مال مویشیوں پر ہاتھ صاف کیا۔
جس پر بلوچوں نے خفیف سومرو سے
شکایت کی۔ خفیف نے سمہ چوروں
کو پکڑ کر سزادی۔یہ سمہ لوگ علاقہ
کچھ سے آئے ہوئے نووارد تھے۔ کچھ
عرصہ بعد جب خفیف سومرہ کی طاقت کمزور
پڑ گئی اور رسموں نے جام انڑ کی سرکردگی
میں اقتدار قائم کیا تو دشتیاریوں
نے اپنے مال مویشیاں سمیٹ لیں اور
پھر کراچی کے ملیر میں چلے آئے ۔یہ
لوگ اندرون سندھ چار پشتون تک

رہے تھے اور ملیر واپس ہونے والا گروہ پانچویں
پشت سے تھے۔یہیں سے کچھ لوگ
اپنے خاندان اور جائداد کی تلاش میں
واپس دشتیاری چلے گئے ۔چوں کہ سندھ
میں ان کی زبان بدل چکی تھی اور انہوں نے
جٹکی (جٹوں کی زبان یعنی سندھی) زبان اپنا
لی تھی اس لیے بلوچوں میں وہ پھر جدگال
مشہور ہوئے۔ جس کے بلوچی میں معنی
''جٹوں کی بولی بولنے والے'' کے ہیں۔
واضح ہو کہ بلوچ سندھیوں کو
جٹ کہتے ہیں ۔چونکہ مغربی بلوچ (ایرانی
بلوچستان کے)فارسی اثرات کی وجہ سے ''ٹ''
نہیں بول سکتے اس لئے جٹ ان کے لہجے میں
جتّ اور جدّ بن جاتا ہے۔اور ''جٹ گال''
کو وہ ''جتگال اور جدگال'' تلفظ کرتے ہیں۔
اسے غلط العام میں بعض جگہ ''جکدال یا جغدال''

بھی بولا جاتا ہے۔اس طرح تاریخی لحاظ سے
جٹکی یا سندھی بولنے والے بلوچ قبائل نے
جدگال کا نام پایا۔جو آگے چل کر ان کی
قبیلائی شناخت بن گیا ''

مذکورہ دشتیاری لوگ اپنے بنیادی یا مرکزی طائفہ کونُہمر دی قبیلہ سے ہونے کے ناطے ہوت بلوچ روایت کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ نہمر دی قوم کی تاریخی نامور شخصیت ''ہوت ابوالفتح بلوچ'' کی نسل سے ہیں:-

''جنہوں نے قلات بلوچستان کے قلعہ
نیچارہ کے اُس وقت کے ایک طاقتور
حاکم میرک یا مورک کو قتل کرکے
سہرائی بلوچوں کو بالادستی دینے
میں مدد دی تھی۔ابوالفتح بلوچ کو
بلوچ لوگ نیم نام کرکے ''بلفت'' کہتے
تھے۔یہی نام پھر اُس کی اولاد اور اقربا
وغیرہ کی قبیلائی شناخت بنا۔بُلفت بلوچ
نے اپنے والد سردار یوسف نہمر دی کی رضا

مندی کے برخلاف اپنے خاندان کی ایک
خوبصورت لونڈی سے شادی رچائی
جس پر باپ نے اُسے گھر سے نکال کر جائیداد
سے عاق کیا۔ بُلفت ناراض ہوکر سندھ
کی سرحد کے ساتھ کوہستان کے نہمر دی بلوچوں
میں گیا۔ اور وہی رہنے لگا۔ کچھ عرصہ رہنے
کے بعد قوم کے لوگوں کے طعنے سُن کر جام نگر
چلا گیا۔ اور وہاں کے راجہ کے دربار کا نائب
مقرر ہوا۔ وہاں پر ایک سمہ عورت سے شادی
کی۔ پھر سمہ حاکم سے اختلافات کی بنا پر کوٹری
کی طرف ہجرت کی اور اپنے قبیلہ کے
ساتھ ایک ندی کے کنارے آباد ہو
گیا۔ پھر یہ مقام اُس کے قبیلہ کے
نام پر بُلفت مشہور ہوگیا۔ جواب
بھی اسی نام سے معروف ہے۔ پھر
یہ قبیلہ تمام جدگال قبائل کا مرکزی

اور سردار خیل طائفہ بن گیا۔"

یادر ہے کہ جھلاوان کی تاریخی لڑائی اسی طائفہ کی سرکردگی میں میروانی کے خلاف لڑی گئی۔جس کا مرکزی طائفہ اور سردار گھرانہ سُوراب کے موضع نغاڑ کا "براہوٗ" طائفہ تھا۔جو تاریخ اور عوام الناس میں "براہو جدگال جنگ" کے نام سے معروف ہُوا۔تاریخی لحاظ سے جو قبیلے یا طائفے جدگال کہلائے ان میں بُلفت یا سندھی لہجے میں بُرفت ،چھٹہ ،موسانی ،گنگہ ،باریجہ،جاموٹ ،بُرہ ،سیاہ پھاد،بیزنجہ،ساسولی ،مردوئی ،رونجھا ،دودا براہمانی وغیرہ شامل ہیں۔قبائل کے پھیلاؤ اور قبائلی رنجشوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ جدگال کو بھی وسیع تر معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔اور پھر بلوچستان میں ہر اس سندھی بولنے والے کو جدگال کہا گیا جو بلوچستان میں رہتا تھا۔سندھ میں رہنے والے جٹ یا سندھی کے لئے جدگال کی اصطلاح استعمال نہیں ہوتی بلکہ اُسے جٹ ہی کہا جاتا ہے۔نیز یہ اصطلاح نسلی معنوں میں مستعمل نہیں ہے واضع ہو کہ بلوچی زبان میں "گال" کے معنی بولی اور بات کے ہیں۔

3۔بلوچ قوم کی تاریخ "جلد اوّل ،از سردار خان گشکوری اردو ترجمہ انور رومان۔

4۔ ایضاً

5۔ ''تاریخ بلوچستان ''از ہتو رام ،تلخیص وتعارف از سلیم اختر صفحہ نمبر 106۔

6۔ ''بلوچستان ،قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں صفحہ 36۔

7۔ ایضاً صفحہ 37۔

8۔ بعض ایرانی وعرب مصنفین نے کوچ وبلوچ کو دو قبیلے ''کوچ اور بلوچ'' لکھا ہے۔ جو کہ غلط ہے۔ ان کو یہ غلط فہمی ''و'' کو ''اور'' کے معنی پہنانے کے باعث ہوئی ہے۔ جیسے کہ فارسی میں اس کے معنی بنتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اس کا استعمال فارسی میں نہیں بلوچی میں ہوا ہے۔ بلوچی زبان میں ''و'' فارسی کے زیر (ِ) کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو ''کا'' کے معنی دیتا ہے۔ کوچ وبلوچ کے بلوچی معنی بلوچ (قوم) کا کوچ (طائفہ) کے بنتے ہیں نہ کہ کوچ اور بلوچ کے جیسے کہ مصنفین نے اخذ کئے ہیں۔ آج بھی بلوچی زبان میں ''و'' کا استعمال اسی طرح موجود ہے۔ مثلاً خرز، خواب خرگوش ،شاہ قلندر ،شاہ جہان، چشم ظاہر ،صدق دل وغیرہ الفاظ کے لئے بلوچی میں ''حروز، واب وکرگوشک ،شاہ وقلندر ،شاہ وجہاں، چم وظاہر ،ستک ودل یا دل وستک بولا جاتا ہے۔ بلوچی شاعری میں بھی سینکڑوں

مقامات پر "و" کا استعمال اسی طریقہ سے ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح کوچ وبلوچ کی ادائیگی بھی بلوچی میں رہی ہے۔ جس سے مراد "کوچ بلوچ" ہیں نہ کہ کوچ اور بلوچ۔ اس کی تصدیق تاریخ سیستان (بہ تصحیح ملک الشعرا بہار) سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ:-

"کوچ ایک گروہ تھا جو کرمان و
مکران وبلوچستان کے حدود میں
سکونت رکھتا تھا اور غالباً یہ
بلوچ کے مترادف تھا۔ یہ طائفہ
قدیم ایام سے راہزنی اور سرکشی
میں شہرت رکھتا تھا۔ اور بڑے
بڑے بادشاہان وقت ان سے نبرد
آزما رہے ہیں۔ یہ طائفہ محمود
غزنوی کی حکومت کے بعد
روبہ زوال ہوا اور بتدریج کوچ کا
نام درمیان سے گم ہوا اور فقط بلوچ کا نام باقی رہ گیا۔"

کرمان اور مکران کے ساحل کے بیچ وسیع پہاڑی علاقے ان بلوچوں کے

مسکن تھے۔ جنہیں عرب جغرافیہ نویس جبال قفص لکھتے ہیں۔ اس پہاڑی خطے کا مرکزی مقام ان کے اپنے نام سے منسوب تھا۔ یعنی کوچ یا کیچ۔ نزہۃ المشتاق میں کوچ قبائل کے علاقے کی حدود اس طرح بیان کئے گئے ہیں:۔

''اُن کے پہاڑ خلیج فارس تک پہنچتے ہیں۔ شمال کی طرف نجرمان تک، جنوب اور مشرق کی طرف سمندر تک اور مکران کے صحرا تک، مغرب کی طرف سمندر اور مُلک بلوچ، ماتبان اور ہرُمز تک۔''

شریف ادریسی نے کوچ و بلوچ قبائل کی زبان کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

''قفص کرمان کی واحد قوم ہے جو فارسی نہیں بولتے۔''

واضح ہو کہ جو زبان مکرانی بلوچی کہلاتی رہی ہے اس کا ایک نام کوچی اور کیچی رہا ہے۔ جو کیچ یا کوچ قبائل کی نسبت سے ہے۔ آج بھی یہ بلوچی ''کیچی'' کہلاتا ہے جو اگرچہ بلوچی زبان سے کوئی الگ زبان نہیں ہے لیکن بلوچی زبان کے مشرقی اور رخشانی لہجہ سے الگ ہے۔ یہ سرحدی رندی لہجہ سے بھی الگ ہے۔ اسی بنا پر دسویں صدی عیسوی کے بعض عرب اور ایرانی مصنفین کو

لکھنا پڑا کہ کوچوں کی زبان الگ ہے حالانکہ یہ زبان نہ پہلے الگ تھی نہ آج الگ ہے۔ صرف لہجہ قدرے مختلف ہے اور بعض اشیاء کے نام رندی بلوچی اور رخشانی بلوچی سے مختلف نام ہیں۔

9۔ ''بلوچستان، قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں'' کے صفحہ 36 پر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ''سیوائی قبائل'' کی اصطلاح انہوں نے فرض کرلی ہے۔ اس کا مقصد اُن قبائل سے ہے جو بقول اُس کے مفروضہ برز کوہیوں سے پہلے آباد تھے۔

10۔ صفحہ 7 اور ''اِن سائیڈ بلوچستان'' صفحہ xiv۔

11۔ اِن سائیڈ بلوچستان'' صفحہ 29۔

12۔ ازمنہ بلوچ۔

13۔ دی کنٹری آف بلوچستان'' صفحہ 29۔

14۔ قدیم سندھ (سندھی) صفحہ 69 صفحہ 70۔

15۔ دی پیپلز آف پاکستان'' صفحہ 35۔

16۔ نیٹیوز آف نارتھرن انڈیا'' صفحہ 27۔

17۔ صفحہ 9۔

18۔ دی کنٹری آف بلوچستان۔

19۔ عمر، میر و براہو میروانی کا بیٹا تھا۔ اور میروانی قبیلہ کا سردار تھا۔

20۔ براہو، میروانی قبیلہ کا سردار گھرانہ کا طائفہ تھا۔ یہ طائفہ سردار براہیم خان عرف براہو میروانی رئیس کے نام پر ہے۔

21۔ بلوچوں کے روایتی جدامجد میر حمزہ جسے بلوچ غلطی سے حضور صلعم کا چچا امیر حمزہ سمجھتے ہیں جو قریش قبیلہ سے تھے۔ اسی غلط فہمی کے نتیجے میں نظم کا شاعر میروانیوں کو بھی قریشی نسل بتاتا ہے۔

22۔ میر حسن، میر عمر براہو کے اجداد سے تھا۔ جس نے پروار گجروں کے خلاف میروزئی اتحادیہ بنا کران سے لڑائی کی۔

23۔ گہرام، میر حسن کا باپ تھا۔

24۔ براہیم، میر گہرام کا باپ تھا۔

25۔ دیکھئے اشاریہ نمبر 21۔

26۔ عباس، روایتوں کے مطابق میر حمزہ کے نو بیٹوں میں سے ایک کا نام تھا۔ جو ایرانی بلوچستان میں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ اُن کی نسل بیر جند کے رئیس کہے جاتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد قریش کے حضرت عباس بھی ہو سکتے ہیں۔

27۔ میر چھٹا قبیلہ کا بلفت جدگال تھا۔ پھر اس کے نام پر نیا قبیلہ ''چھٹا'' تشکیل پا گیا لیکن چھٹا کہتے ہیں کہ قبیلہ کا جدامجد یہ چھٹہ نہیں تھا۔ وہ ''چھٹہ''

اول تھا جو اِس ''چھٹہ'' کا دادا تھا۔ قبیلہ کا مرکز ''دریجی''، ضلع لس بیلہ ہے۔

28۔ گرگین جسے بعض اوقات ''گورگند'' بھی کہا جاتا ہے، اس داستان کے مطابق میر عمر براہو کا بھائی ثابت ہوتا ہے۔ جدگالوں کے ساتھ لڑائی میں گرگین کا لشکر گرگینانی کہلایا۔ جو گرگناڑی بھی بولا جاتا ہے۔ جو اُس کے نام سے تشکیل پانے والا قبیلہ تھا۔ جہلاوان گزیٹر نے ان کو اُن کے اپنے حوالہ سے قریشی عرب بتایا ہے۔ اور پھر مقامی روایات کی رد سے گرگین کو میروانیوں کے جدامجد میرو کا بھائی بتایا ہے۔ جو غلط ہے۔ گرگین میرو کا بیٹا تھا۔

29۔ سُماعیل، ذگر قبیلہ سے تھا۔ یہ قبیلہ پنجگور کی وادی گچک کا قدیم رئیس قبیلہ رہا ہے۔ جو قلات کے دشت گوران میں آباد ہوگیا تھا۔ سماعیل نے شروع میں جدگالوں کے خلاف لڑائیوں میں حصہ لیا تھا۔ اس کا لشکر اُس کے نام کی نسبت سے سماعیلانی کہلایا جواب سُمالانی اور سُمالاڑی بولا جاتا ہے۔ اپنے قبیلے کا جد بنا۔ براہو میروانیوں کا داماد تھا۔ جہلاوان گزیٹر میں اُسے میروانیوں کا بھائی بتایا گیا ہے۔ جو غلط ہے۔ سُماعیل قوم کا ذگر رئیس تھا جبکہ میرو، براہو میروانی قبیلہ سے تھا۔ اس کے علاوہ سُماعیل، میرو کے نواسے میر بجار کا ہم عصر اور جنگ کے شروع میں میروانیوں کا اتحادی تھا۔

30۔ قلندر، میر عمر براہو میروانی کا بھائی تھا۔ جدگالوں کے بڑے حملے میں

اپنے بھائی میر عمر براہو کے ساتھ مارا گیا۔اس کے اتحادی اور لشکر اُس کی نسبت سے قلندرانی کہلائے۔ نئے قبیلہ قلندرانی کا جدّ بنا۔ جہلاوان گزیٹر میں اُسے میر وخان میروانی کا بھائی لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔قلندر میر و براہو میروانی کا بیٹا تھا۔

31۔ ہالہ،قلندر کا بیٹا تھا۔اپنے خاندان کے ساتھ جنگ میں شامل تھا۔اُس کے نام سے نیا قبیلہ ''ہالہ زئی'' بنا۔

32۔احمد، قلات کا ایلتازئی رئیس تھا۔اپنے لشکر کے ساتھ براہو میروانی کا جنگی اتحادی تھا۔پھر اُس کے نام سے نیا قبیلہ ''احمدزئی'' تشکیل پایا۔جس کا وہ جدامجد ہے۔خان احمد یارخان بلوچ نے اپنی کتاب ''ان سائیڈ بلوچستان'' میں احمدزئی کو میروانی کی شاخ لکھا ہے۔جبکہ اپنی دوسری کتاب ''مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ'' میں اپنے اِس قبیلہ کو ''کمبرانی'' کی شاخ لکھتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ احمدزئی ،ایلتازئی رئیس ہے۔معروف محقق سردار خان گشکوری لکھتے ہیں کہ معلوم تاریخ سے پہلے احمدزئیوں کے ''جدامجد'' رئیس'' کہلاتے رہے ہیں (ہسٹری آف بلوچ ریس اینڈ بلوچستان صفحہ 76)۔

33۔مہراب ،احمد ایلتازئی رئیس کا بیٹا تھا۔باپ کے ساتھ براہو میروانی کا

اتحادی تھا۔

34۔مراد ذگر مینگلوں سے ہے جو پنجگور کی وادی گچک کا رئیس قبیلہ تھا۔ گچک میں ان کی قدیم آبادی کا نشان ''ذگرانی کہور''یعنی ذگروں کی ندی کے نام سے موجود ہے۔ ذگروں نے رندوں کے ساتھ بطرف قلات ہجرت کی اور دشت گوران میں قیام کیا۔ چونکہ تعداد میں کم تھے اور مینگل سرداری کے ماتحت ہوئے اس لئے مینگل کا نام ان پر چسپاں ہوگیا۔وگرنہ نسلی لحاظ سے وہ میروانی اور احمدزئی کے ہم نسل اور ہم قبیلہ یعنی رئیس تھے۔میروانی سے بہ سبب ناراضگی بطرف نوشکی چلے گئے اور جدگالوں کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لیا۔اگرچہ بعد میں صلح ہوگئی۔کتاب ''سیستان'' کے مصنف جی۔پی ٹیٹ نے ان کے حوالہ سے انہیں سمرقند کے قریب ''زغد'' کے جگہ سے ہجرت کرکے آنے والے لکھا ہے جوکہ ٹیٹ کی سوفیصد غلط بیانی ہے۔میر گل خان نصیر نے ذگر کو جوان کا اپنا قبیلہ ہے کسی ذکریا ''نامی شخص سے منسوب کیا ہے اور ذکریا کو براہو جدگال جنگ میں شامل بتایا ہے۔جبکہ اس جنگ کی داستان میں کسی ذکریا کا نام نہیں آتا اور ذگر نام بطور قبیلہ آتا ہے جوثابت کرتا ہے کہ قبیلہ پہلے سے موجود رہا ہے۔

35۔ٹوہو،قلندرانی تھا اور ہالہ قلندرانی کا بھائی اور قلندر براہو کا بیٹا تھا۔

36۔ گوشو کا اصل نام ''جا مک'' تھا۔ لمبے کانوں کی وجہ سے اُسے ''گوشو'' کہا جاتا ہے۔ گوش بلوچی میں کانوں کو کہتے ہیں۔ یعنی لمبے کان والا۔ گوشو کا خاندان میروانیوں کے نسلی خدمتگار تھے۔ جو پنجگور تسپ کے نقیبوں سے تھے۔ میر کمبر رئیس اپنے رشتہ دار خاندانوں کی خدمت کیلئے نقیبوں کو ساتھ لایا تھا۔ نقیب دیگر غلاموں کی نسبت زیادہ وفادار اور حیادار ہوتے تھے۔ اسی لئے سردار لوگ انہیں گھروں میں اپنے اولاد کی طرح رکھتے تھے اور ان سے غلاموں جیسا سلوک نہیں کرتے تھے۔ اسی وفاداری اور ننگ داری کے تجربہ کے پیش نظر بی بی ماہناز نے بجار کو صرف گوشو کے پاس جانے اور اُس سے اپنا دلی مدعا کرنے کی ہدایت کی۔ اور گوشو نے جدگالوں کے خلاف میروانیوں اور اس کے اتحادیوں کا بندوبست کر کے اس جنگ کو فتح سے ہمکنار کیا۔

37۔ یہاں مُلک سے مفتوحہ علاقے مراد ہیں اور قبائل سے مراد اس جنگ میں براہو میروانیوں کے اتحادی ہیں۔

38۔ ملک دوستین، خاران کا نوشیروانی سردار تھا۔ بڑا دلیر اور جنگجو شخص تھا۔ اُسے ساتھ ملانے کا مقصد خاران کے علاقوں سے بھی جدگال لوگوں کا خاتمہ کرنا اور انہیں بیدخل کرنا تھا۔

39۔گواراں، نسلاً ہوت اور لسانی طور پر بُلفت جدگالوں سے تھا۔لیکن میروانیوں کا اتحادی بنا۔دوران جنگ اس کے نام سے قبیلہ گوارانجو'' تشکیل پایا۔یہ ترکیب جدگالی زبان کی ہے۔بعض گوارانجو، سوپک ساسولی کو اپنا نسلی بھائی کہتے ہیں۔ساسولی ہونے کی نسبت سے سوپک بھی بُلفت قبیلہ سے تھا۔لیکن ان کی زبان جدگالی نہیں بلوچی تھی۔ان کی رشتہ داری رندوں سے تھی۔وہ رخشان میں نوشیروانی سردار کا نائب تھا۔جس نے نوشیروانی سردار کی طرف سے جنگ میں میروانیوں کا ساتھ دیا۔میر گل خان نصیر نے اُسے ''سیاہ پاد'' لکھا ہے۔سیاہ پاد بھی بلفت جدگالوں سے تھا۔لیکن یہ بلوچی زبان اختیار کر چکے تھے۔اور اب میروانیوں کے اتحادی بنے تھے وہ اپنی ملکیتوں سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے تھے۔انہیں میروانیوں کے غالب آنے کا یقین تھا۔اور انہوں نے اپنے دو سرکردہ شخص زنگی اور سہراب جت (شتر پال) کی سرکردگی میں اپنے حمایتوں کے ساتھ بجار کی مدد کی۔سوپک اور زنگی کے نام سے نئے قبیلہ ''سوپک'' اور زنگیانی بنے زنگی کا اپنا خاندان جدگالی میں زنگیچو کہلایا۔

40۔دیکھئے ''اشاریہ نمبر 39۔

41۔مراد ''میر عمر براہو'' کے باپ میرو براہو میروانی سے ہے۔جس کے

سو پک اور گواران اتحادی تھے ۔ جواب اُس کے نواسے میر بجار کے بھی اتحادی تھے۔ اوراس وقت عمر رسیدہ تھے۔

42۔ حمل بیز نجو اور نندہ بیز نجو نسلاً بلفت جدگالوں سے تھے ۔ لیکن نوہانی رندوں سے ان کی رشتہ داری تھی اور علاقے میں نوہانی رندون کی سرداری اور عملداری میں ہونے کی نسبت سے ان کا شمار بلوچی قبائلی سسٹم کی رو سے نوہانی قبیلہ سے ہوتا تھا۔ دونوں بیزن بُلفت کے بیٹے تھے۔ ان کا قبیلائی نام جدگالی بندش میں ہے ۔ بیز نجو سردار، عمر نوہانی کو جسے نظم میں عمر بُزدار (بکریاں پالنے والا) کہا گیا ہے کو حمل اور نندہ کا بھائی بتاتا ہے لیکن عمرانی سردار گھرانہ جو اسی عمر بزدار کے نام سے تشکیل پا گیا ہے بیز نجو ہونے سے انکاری ہے ان کا کہنا ہے کہ عمر اپنے لشکر کے ساتھ بیز نجو لشکر میں شامل ہونے کی بنا پر بیز نجو کہلاتا ہے نہ کہ ان کے ہم نسل ہونے کی بنا پر۔ نیز اسی جنگ کے دوران حمل اور نندہ اور عمر کے ناموں سے حملانی، نندوانی اور عمرانی قبیلے بنے (عمرانی سردار کا کہنا ہے کہ عمرانی قبیلہ پہلے سے موجود تھا جسکی اکثریت نصیر آباد کو جا چکی تھی اور ہم لوگ پیچھے رہ گئے تھے اور مذکورہ عمر بزدار خود عمرانی قبیلہ سے تھا)۔ جدگالوں کے سرکردہ شخص یوسف کے نام سے قبیلہ ''یوسفانی'' وجود میں آیا اور وہ اس کے جدّ ٹھہرے۔ میر گل خان نصیر

نے اپنی نام نہاد تاریخ میں لکھا ہے کہ حمل بیز نجو کی سرکردگی میں نال کے لشکر کا مقابلہ جدگال لشکر سے سمان (خضدار کے قریب) کے مقام پر ہوا۔ لیکن رزمیہ نظم سمان کا نام نہیں لیتی اور صرف یہی بتاتی ہے کہ جو لشکر نال سے روانہ ہوا اُس کا مقابلہ یوسف جدگال سے ہوا اور جدگال کٹ مر کر بھاگ گئے اور گروک، نال، ہزار گنجی، وڈھ اور ناچ سے بھی آگے نکل گئے۔ درمیان میں مند سے پورالی تک دونوں لشکروں میں زبردست لڑائیاں چلتی رہیں تا کہ دونوں قبیلوں میں حد بندی ہوگئی۔

43۔ کنر چاری کا موجودہ نام ''کنر'' ہے جو پورالی ندی کے مشرقی سائیڈ موضع ''کونڈی'' کے باالمقابل ہے۔

44۔ شاعر کے مذکورہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً یہ علاقے اس سے قبل میروانیوں کی مقبوضات تھیں جنہیں جدگال بعد میں کسی وقت قبضہ کر چکے تھے اور یہی مقبوضات ''براہو جدگال جنگ'' کے سبب بنے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیلہ لک سے آواران تک کے درمیانی علاقوں میں میرو اور اس کے بھائی سنجر کی سرکردگی میں قبائل سے ان کی لڑائیوں کے مختصر تذکرے قدیم بلوچی شاعری میں محفوظ ہیں۔

45۔ کمبر کہدائی، میر بجار سپریم کمانڈر کے بعد براہو اتحادیوں کا سب سے

بڑا کمانڈر تھا۔ اس سے قبل وہ کئی جنگوں میں تلوار کے جوہر دکھا چکا ہے ۔روایتوں کے مطابق وہ میروانیوں کا داماد اور قلات کے میر ایلتاز ایلتازئی کا سالا یعنی میر احمد کا ماموں تھا۔

46۔ کسی وقت میروانیوں کے ہاتھوں شاہی زئیوں کا جدامجد شاہی قتل ہوگیا۔ شاہی زئی مینگلوں نے محمد زئی قبیلہ کے جدامجد محمد کے ذریعہ میروانیوں کے قلعہ نغاڑ کے حاکم اور میروانی سردار میر وبراہو کو قتل کروا دیا۔ اس طرح دونوں قبیلوں کے درمیان دشمنی اور ناراضگی تھی ۔ جواب صلاح پر منتج ہوگئی تھی ۔ رائے ہتورام اپنی تاریخ بلوچستان (تلخیص از سلیم اختر صفحہ 236) میں لکھتے ہیں کہ میروانی کے ساتھ مینگل کی صلح اُس وقت ہوئی جب ملک بجار میروانی قلات پر قابض ہوا۔

47۔ حاجی سوپک کے لئے دیکھئے اشاریہ نمبر 39۔

48۔ گواران کے لئے دیکھئے اشاریہ نمبر 39۔

49۔ صلاحی کو میروانی قبیلہ سے بتایا جاتا ہے۔ پھر نئے طائفے ''صلاحی'' کا جد بنا۔ میروانی اسے سرمستانی بتاتے ہیں۔ موجودہ وقت میں وہ سرمستانی ہیں۔

50۔ زرّک، قبیلہ کا رئیس توک تھا۔ نئے طائفے زرّک زئی'' کا جد بنا۔

51۔حالد، دراصل خالد کا بلوچی لہجہ ہے۔قبیلہ کا جلمب زئی تھا۔دوران جنگ اس کے اتحادی ''حالدانی'' کہلاتے تھے۔وہ اس نئے قبیلہ کا جدتھا۔بعداز جنگ اس کے اتحادی الگ الگ ہوئے۔اس لئے پھر حالدانی محدود ہوکرصرف ''حالد'' رہ گیا۔اب یہ طائفہ صرف ''حالد'' کہلاتا ہےاور میروانی کا ذیلی طائفہ ہے۔

52۔دیکھئے اشاریہ نمبر 36۔

53۔براہو، براہیم کا نیم نام تھا۔ بلوچ اکثر مکمل ناموں کو نیم نام کرکے بولتے ہیں اور یہ بچپن اورلڑکپن کے ایام میں رکھے جاتے ہیں لیکن پھر آخر عمر تک پکا ہوکر زبان زدعوام ہوتے ہیں۔ براہیم نام دراصل ابرہیم کی بلوچی ادائیگی ہے۔وہ میرو، عمر اور بجار کے اجداد سے تھا۔جیسے کہ رزمیہ داستان میں بیان ہوا ہے۔ مصنفین نے ان کے بارے میں بھی مفروضے قائم کئے ہیں۔''تاریخ الابرار'' میں لکھا گیا ہے کہ میر بجار کی وفات کے بعد مغلوں نے آکر قلات پر قبضہ کیا۔انہوں نے قلات کے دہواروں کے ساتھ روایتی ہتھیاروں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا۔اور پھراُن پر ظلم کا بازار گرم رکھا۔ دہواروں نے باجرے کی سخت ٹھوس روٹیاں بنائیں اور بغلوں میں یہ روٹیاں دباکر مغل حاکم، جس کا نام اور اس کا سن حکمرانی مصنف کو

معلوم نہیں ہے، کے سلام کو دربار میں گئے۔ اور اُس پر اچانک حملہ آور ہو کر اُسے قتل کر دیا (یہ مغل حاکم جو ظالم بھی تھا، ایک لاوارث اور تنہا شخص کی مانند موت کے منہ میں چلا گیا) مغل کو مار ڈالنے کے بعد دہوار معتبرین میر ابراہیم خان کے پاس گئے اور اُسے صورت حال بتا کر کہا کہ اپنے بیٹوں میں سے ایک کو ہم دہواروں کے ساتھ کر دیں کہ اُسے لے جا کر قلات کا حاکم بنائیں۔ اور میر ابراہیم خان نے اپنا نواسہ میر حسن کو دہواروں کے ساتھ بھیج دیا۔ دہواروں نے اُسے قلات لا کر حاکم بنا دیا (تاریخ خوانین قلات صفحہ 29 وصفحہ 30) آخوند نے یہاں میر ابراہیم کو بحثیت سرپرست اور سردار کے پیش کیا ہے۔ اور اُسے میر بجار کی وفات کے بعد زندہ صورت میں پیش کیا ہے۔ اب ملاخطہ کیجئے وہ شجرہ نسب جوان کی کتاب کے صفحہ 21 پر درج ہے میر بجار کا ہم عصر، احمد زئی خوانین کا جد امجد میر احمد تھا جو میر بجار کا جنگ میں اتحادی بھی تھا۔ میر احمد سے یہ شجرہ نسب یوں دیا گیا ہے:-

میر احمد بن میر ایلتاز بن میر کیچی
بن میر ایلتاز بن میر احمد بن میر
قیصر بن میر سوڈو بن میر احمد بن

میر کمبر بن میر ملوک بن میر سنجر بن

میر حسن بن میر گہرام بن میر براہیم۔''

اس شجرہ نسب میں میر ابراہیم خان، میر احمد سے تیرھویں پُشت پر ہے اور اُن کا نواسہ میر حسن گیارھویں پُشت پر ہے۔ میر بجار کے زمانے سے گیارہ پُشت (230 سے 270 سال) قبل کا میر حسن 1666ء کے آس پاس قلات کا خان کیسے بن سکتا ہے۔ یہ دروغ گوئی کا ایک ثبوت ہے۔ دوسرا ثبوت قلات پر مغل اقتدار کا ہے۔ آخوند لکھتا ہے کہ میر بجار کی وفات کے بعد مغلوں نے آ کر قلات پر قبضہ کیا، اور اس مغل حاکم کو دہواروں نے قتل کر دیا۔ پھر میر حسن کو انہوں نے حاکم بنا دیا، پھر لکھتے ہیں کہ جب میر احمد خان کی نوبت آئی تو اُس نے مستونگ کے علاقے مغلوں سے چھین لیا۔ آغا جعفر مغل لشکر لے کر قلات آیا۔ لڑائی ہوئی اور مغلوں کو شکست ہوئی یہاں آخوند نے میر ابراہیم کے زمانہ (1666ئے تقریباً تین سو سال قبل) سے مغل حکومت کا تذکرہ کیا ہے اور اسے 67-1666ء تک برقرار دکھایا گیا ہے یعنی قلات پر مغلوں کا عرصہ حکومت تین سو سال تک مسلسل رہا جو دنیا کی کسی کتاب میں ثابت نہیں ہے۔ دروغ گوئی کا یہ دوسرا ثبوت ہے۔ پھر صفحہ 31 پر لکھتے ہیں کہ:-

''میر حسن کے عہد سے میر احمد (اول) جس نے باروزئیوں سے کئی لڑائیاں لڑیں ، کے عہد تک ملک کا یہ حصہ یعنی قلات ،سوراب وڈھ اور منگچر احمد زئیوں کے زیر تصرف تھا۔''

حالانکہ اس سے پہلے وہ کہہ چکے ہیں کہ اسی عرصے میں ملک مسلسل مغلوں کے قبضے میں رہا ہے۔اور مذکورہ میر احمد ہی احمد زئیوں کا جدامجد ہے جو میر بجار کا ہمعصر اور جنگ میں اُس کا اتحادی تھا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے احمد زئی کہاں سے آئے۔حقیقت یہ ہے کہ میر سمندر خان کی حکومت سے پہلے کے جتنے واقعات آخوند نے بیان کئے ہیں وہ خودساختہ اور جھوٹی کہانیاں ہیں ۔معلوم ہوتا ہے کہ دہواروں نے ہی اُنہیں یہ سب کچھ ڈکٹیٹ کرایا ہے۔

54۔میرو براہو، بلوچ روایتی تاریخ میں کوئی گمنام شخصیت نہیں رہی ہے۔جس کے بارے میں مفروضات قائم کئے جائیں۔لیکن کیا کیجئے کہ نام نہاد مصنفین اور مورخین نے من گھڑت کہانیاں بنا کر کئی دیگر تاریخی شخصیتوں کی طرح اس شخصیت کو اندھیروں میں دھکیل دیا ہے۔ان نام نہاد مصنفین کا

سُرخیل ''تاریخ الابرار'' کے مصنف آخوند محمد صدیق تھے۔جن کی بے شمار مفروضات کا ہم جائزہ لیتے آرہے ہیں۔آخوند کے بعد کے مصنفین نے بھی آخوند ہی کی سنت کی پیروی کی ہے۔میر گل خان نصیر اپنی کتاب ''بلوچستان،قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں'' کے صفحہ 36 پر میرو کو کوچ وبلوچ کے فرضی لشکر کا سردار بتاتا ہے جو ایران کے کوہ البُرز سے ایرانی شاہنشاہ انوشیروان کے حملوں کے نتیجے میں کوچ کر کے قلات کے اطراف میں آکر مقیم ہو جاتا ہے۔اور پھر صفحہ 143 پر اپنے قبیلہ ''مینگل'' کو البُرز سے آنے والا قبیلہ بتاتے ہوئے میرو کو اسی لشکر کا سربراہ لکھتا ہے:۔

''مینگل ،کوہ البرز سے سردار
میرو کی سرکردگی میں نقل مکانی
کر کے قلات کے کوہستان میں آئے''

حیرت ہے کہ پھر اسی کتاب کے صفحہ 269 پر وہ اپنے بیان کو بھول جاتا ہے اور کسی ''قمبر'' کو اسی بُرز کوہ کے لشکر کا سربراہ لکھتا ہے۔اس سے قبل انہوں نے اپنی پہلی کتاب ''تاریخ بلوچستان'' کے صفحہ 5 پر پھر اسی موقف کو اپنایا تھا اور پھر صفحہ 148-146 پر انہوں نے میرو کی بجائے ''کمبر'' کو اس لشکر کا سربراہ بتایا ہے جبکہ دنیا کی کوئی تاریخ ایران سے بطرف قلات کسی

مہاجرت کا ذکر نہیں کرتا۔اور نہ ان کی کوئی تاریخی روایت موجود ہے۔ دراصل میر موصوف نے یہ کہانی ابوالقاسم فردوسی کے شاہنامہ سے اخذ کیا ہے جس میں فردوسی کرمان کے قرب وجوار میں بلوچوں پر انوشیروان کے حملوں کا تذکرہ کرتا ہے۔لیکن وہ کسی ہجرت کی بات نہیں کرتا۔میر گل خان کے متضاد بیانات ثابت کرتے ہیں کہ میر صاحب کو نہ اپنے میرو کے بارے میں علم ہے اور نہ کمبر کے بارے میں۔وہ من گھڑت قصے بیان کر کے تاریخ کے قاری کو گمراہ کرتے ہیں۔خان احمد یار خان،صالح محمد لہڑی،ملک محمد سعید وغیروں نے انہی مفروضات کی بار بار تشہیر کی اور براہوئی تاریخ کو پیچیدہ بناتے رہے۔حالانکہ میرو کے بارے میں کولواہ سے لے کر سوراب تک کے علاقے میں بیسویں لوگ اچھا خاصا جانتے ہیں اور اُس کی زندگی پر بات کر سکتے ہیں۔جیسے کہ نظم میں اشارے ملتے ہیں کہ میرو،قلعہ نغاڑ سوراب کا سردار اور میروانیوں کا ایک لڑاکو شخص تھا اور کئی خطوں کا فاتح تھا۔ میروانیوں اور شاہی زئی مینگلوں کے بابین دشمنداری کی ایک لڑائی میں میروانیوں کے ہاتھوں میر شاہی رند قتل ہو گیا تھا۔جس پر شاہی زئیوں نے سوراب کے آس پاس کے قبائل میں اعلان کرایا کہ جو شخص میرو کو قتل کر کے اُس کا سر شاہی زئیوں کو پیش کریگا اُسے وڈھ کا تیسرا حصہ دیا جائیگا اور اُس

کے اہل خاندان کی حفاظت کے لئے اُسے دو قبیلے بطور محافظ ہمسایے دیئے جائیں گے۔ موضع محمد تاوہ کے محمد نامی شخص نے میرو کے قتل کی حامی بھری اور اُس کی جاسوسی پر آدمی لگا دیئے۔ ایک دن جب میرو اپنے محافظوں کے ساتھ شکار سے واپس سوراب کی طرف آ رہا تھا۔ محمد اور اُس کے آدمیوں نے اُن پر حملہ کر دیا اور میرو کو قتل کر کے اُس کا سر اور شاہی انگوٹھی مع انگلی کاٹ کر کے وڈھ شاہی زئیوں کے پاس پہنچا دیئے۔ شاہی زئیوں نے وعدے کے مطابق محمد کو باڈری کا علاقہ وڈھ کے تیسرے حصے کے طور پر دیا اور دو قبیلے شیخ میراجی اور رمدان زئی قبیلے اُن کی ہمسائیگی میں دیئے۔ محمد ،محمد زئی مینگل قبیلہ کا جدامجد بنا جسے قبیلہ رئیس توک سے روایت کیا جاتا ہے۔ محمد، زرّک اور شاہو تین بھائی تھے جو پھر میروانیوں کے انتقام کے خوف سے محمد تاوہ چھوڑ گئے۔ محمد کو باڈری مل گیا۔ زرّک، مستونگ میں زرخیلوں کی پناہ میں گیا۔ پھر موسیانی زہریوں کے ہاں چلا آیا اور شاہو، ملخوڑ میں خدرانیوں کی پناہ میں گیا۔ زرّک، زرکزئی اور شاہو، شاہوزئی خدرانی قبیلے کے جد بنے۔ جس جگہ پر میرو کو قتل کیا گیا وہ مقام نغاڑ سوراب کے نزدیک ہے اور ''ہیزانی چیدہ'' کہلاتا ہے۔ بطور نشانی وہاں پر بڑے بڑے پتھروں کا ڈھیر لگا دیا گیا ہے۔

55۔میر عمر براہو کے بارے میں بھی متذکرہ بالا نامی گرامی مورخین نے مفروضے گڑھ کر انہیں تحریری تاریخ کا حصہ بنادیا ہے۔میر گل خان نصیر نے اپنی ''تاریخ بلوچستان'' میں انہیں قلات کا حکمران لکھا اور یہ مفروضہ کہانی اس طرح گڑھی کہ اُس زمانے میں قندھار کے حکمران کی طرف سے ذوالنون بیگ ارغون اور شاہ بیگ ارغون قلات میں گورنر تھے۔جب 1530ء میں مرزا کامران نے قندھار میں ارغونوں کو شکست دی اور ان کی طاقت پاش پاش ہوگئی تو میر عمر نے اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر ایک بلوچ فوج جمع کی اور ذوالنون بیگ ارغون کو شکست دی اور اسے افغانستان بھاگ جانے پر مجبور کردیا۔اس طرح قلات میں میروانی حکومت کی بنیاد پڑی۔

مندرجہ بالا کہانی ایک بے بنیاد بات ہے اور میر گل خان کی اپنی ذہنی اختراع ہے جس کے بارے میں معروف محقق جسٹس میر خدا بخش مری نے یوں لکھا ہے۔

> ''مندرجہ بالا بیانات بے بنیاد اور
> ناقابل قبول ہیں بلکہ حقیقتاً وہ تاریخی
> واقعات اور دوسرے مقامات پر اس کتاب

کے پیش کردہ مواد کے بالکل خلاف بھی
ہیں۔مثلاً یہ کہنا کہ قندھار کے حکمران
نے ذوالنون اور شاہ بیگ کو قلات
کے گورنر مقرر کیا تھا۔اور 1530ء میں
ذوالنون بیگ ارغون میر عمر خان میرواڑی
سے ایک لڑائی میں شکست کھا کر
قلات سے چلا گیا ،اُس دور کے تاریخی
واقعات سے ناواقفیت کا مکمل
اظہار ہے ۔ذوالنون بیگ ارغون
قندھار کے حکمران کا مقرر کردہ
نہیں تھا ۔نہ ہی 1530ء میں
اُس نے میر عمر میرواڑی سے شکست
کھائی تھی اور نہ ہی شہنشاہ بابر کے
لڑکے کامران مرزا نے اسے قندھار سے
نکالا تھا۔ اس کے برخلاف ذوالنون
بیگ خود قندھار کا گورنر تھا۔ جسے

ہرات کے بادشاہ شاہ حسین نے
مقرر کیا تھا۔اس لئے میر گل خان
نصیر کے بیان کے برعکس وہ نہ کبھی
قلات کا گورنر رہا اور نہ ہی کبھی اس کی
لڑائی عمر میر واڑی سے ہوئی۔ علاوہ ازیں
ذوالنون بیگ تو 1530 میں زندہ بھی
نہیں تھا۔ کیونکہ وہ 1507ء میں محمد خان
شیبائی ازبک کے خلاف ہرات میں
ایک لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اور پھر یہ
بات بھی یاد رہے کہ ذوالنون بیگ کے
لڑکے شاہ بیگ کو 1522ء میں قندھار
کے بادشاہ بابر کے حوالہ کرنا پڑا تھا نہ
کہ اس کے لڑکے کامران کے ۔
بنا بریں میر گل خان کا یہ تمام بیان
دُرست نہیں اور ارغونوں سے اُس کی
جنگ غیر تاریخی باتیں ہیں ۔'' (بلوچستان

تاریخ کے آئینے میں صفحہ 356)۔

میر گل خان نصیر نے اس فرضی کہانی کو مختلف غیر تاریخی اور غیر حقیقی سیاق وسباق میں بیان کر کے تاریخ سے نابلد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی کہانی انہوں نے آخوند محمد صدیق کی ''تاریخ الابرار'' میں بیان کردہ مغل حکمرانی کے پس منظر میں گھڑ لیا ہے۔ جس کو خود میر گل خان اور ملک محمد سعید دہوار اپنی تاریخوں میں ''غیر معتبر راوی'' کہتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں:۔

''آخوند مُلا محمد صدیق کی تحریریں
بڑی مُشتبہ ہیں۔ اوران پر مکمل
اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔'' (بلوچستاں،
تاریخ کی روشنی میں، صفحہ 780 از ملک سعید)۔

پھر لکھتے ہیں:۔

بلوچی رزمیہ داستانیں ملا محمد صدیق
کی تحریروں کی نسبت زیادہ قابل بھروسہ
ہیں۔ کیونکہ بلوچی شُعرا اس قسم کی
نظمیں واقعات کے فوراً بعد مرتب کیا کرتے

تھے ۔اور یہ پُرانی اور سُنی سُنائی روایات
پر مبنی نہیں ہوتی ہیں ۔(ایضاً صفحہ 784)۔

گل خان نصیر نے آخوند کی نگارشات کے بارے میں اپنی رائے ،آخوند کی کتاب ''اخبارالابرار'' کا بنام ''تاریخ خوانین قلات'' ترجمہ کرتے وقت صفحہ 12 پر درج کی ہے۔اس کے باوجود انہوں نے ایک جھوٹی کہانی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔آخوند نے لکھا ہے:-

''قلات سیوا ہندو کا تھا۔ سیوا کے
بعد قلات پر مغل قابض ہوگئے
مغلوں کو خراسان میں لڑائی پیش
آئی ۔میر عمر میروانی قلات کا حاکم
بن بیٹھا۔''

پھر لکھا کہ چاکر سردار رند اور گہرام لاشاری نے مکران سے قلات کا رُخ کیا۔تب میروانیوں اور چاکر بلوچ کے والد شیہک کے درمیان لڑائی ہوئی ۔بلوچوں کا لشکر غالب آ گیا (وہ رند لشکر کی بجائے بلوچ لشکر کے الفاظ استعمال کرتا ہے جبکہ چاکر، رند سردار تھا) اور میر عمر لڑائی میں مارا گیا۔قلات کو میروانیوں سے لے لیا گیا۔(اخبارالابرار کا اردو ترجمہ بنام'' تاریخ

خوانین قلات'' از میر گل خان نصیر صفحہ 23)۔آخوند ملا محمد صدیق کی یہ گھڑی ہوئی کہانی میر گل خان نصیر نے اپنی تاریخ میں اپنے نام سے دُھرائی (دیکھیے صفحہ 5 وصفحہ 6)۔لیکن پھر اپنی غلطی پر پچھتایا اور ''اخبار الابرار'' کے اردو ترجمہ کے صفحہ 23 اور صفحہ 24 پر آخوند محمد صدیق کے موقف کی برملا تردید کی:۔

''یہ بیان صحیح نہیں ۔یہ لڑائی نغاڑ سوراب پر جدگالوں اور میروانیوں کے درمیان ہوئی۔ ''

''سردار میرو کا بیٹا میر عمر جھلاوان کے جدگالوں کے خلاف لڑائی میں مارا گیا۔ ان دنوں وہ نغاڑ علاقہ سوراب میں رہتا تھا۔ آخوند کی رائے کہ میر عمر قلات میں تھے اور رندو لاشار کے خلاف لڑائی میں مارے گئے ،صحیح نہیں ہے ۔بلوچی اشعار اور دیگر دستاویزات میں اس کا ثبوت نہیں ملتا ۔جبکہ

جدگالوں کے ہاتھوں اس کے مارے
جانے کے ثبوت میں بلوچی اشعار
کی سند موجود ہے۔"

پھر اسی کتاب کے صفحہ 27 کے حاشیے میں لکھتے ہیں:۔

"میر عمر میروانی سوراب کے علاقہ
نغاڑ میں رہتا تھا۔قلات پر براہوئیوں
کا قبضہ میر بجار کے بعد ہوا۔"

مندرجہ بالا متضاد بیانات کی متواتر مختلف کتابوں کے ذریعہ تشہیر اور پھر تاریخی انکشافات سامنے آنے کے بعد نام نہاد مصنفین کو اپنے من گھڑت کہانیوں اور مفروضات کی بقلم خود تردید کرنا پڑ رہی ہے اور انہی حقائق پر بھروسہ کرنا پڑ رہا ہے جو بلوچی رزمیہ داستانوں میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔

56۔بجاّر کے بارے میں مزید معلومات کے لئے دیکھئے اشاریہ نمبر 59

57۔دیکھیے اشاریہ نمبر 2۔

58۔بُلفت کے لئے اشاریہ نمبر 2 ملاحظہ کیجئے۔

59۔یاد رہے کہ "براہو جدگال جنگ" کے اس تاریخی واقعہ کو "اخبار الابرار" (فارسی) کے نام سے خوانین قلات کی تاریخ کے مصنف آخوند محمد صدیق

نے غلط رنگ میں پیش کر کے تاریخ کے طالب علم کو گمراہ کیا۔ آخوند نے اس تاریخی لڑائی کو جس کا معروف نام ہی ''براہو جدگال جنگ'' ہے، میروانی رند لڑائی کا نام دیا اور اس کی تشہیر کی انہوں نے لڑائی کا مقام سوراب کی بجائے قلات لکھا۔

مذکورہ تاریخی رزمیہ داستان نے جو خود میروانی قبیلہ کے شاعر کا نظم کردہ ہے، آخوند کی فرضی اور جھوٹی کہانی کو کلیتاً رد کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ مذکورہ لڑائی رندوں اور میروانیوں کے درمیان نہیں بلکہ براہو میروانیوں اور جدگال قبائل کے درمیان چراگاہوں اور خشکابہ اراضیات کی ملکیت پر لڑی گئی ہے۔ نظم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ یہ لڑائی قلات میں نہیں بلکہ سوراب کے موضع نغاڑ میں لڑی گئی اور پھر آگے جنوب کی طرف بڑھتی گئی اور اس لڑائی میں میروانی سردار میر عمر براہوا اپنے بھائی قلندر براہو کے ساتھ جدگالوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ نظم نہ کسی رند شخصیت کا ذکر کرتی ہے اور نہ رند قبیلہ کا اور نہ کہ وہ اس لڑائی کو قلات کی حکمرانی اور بالادستی کی لڑائی کہتی ہے بلکہ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ قلات سیوا کا مُلک ہے جہاں پر میروانیوں کے رشتہ دار موجود ہیں۔ اور لڑائی کے روز کوئی عزیز براہو میروانیوں کی مدد نہ کر سکا۔ نظم نے سوراب کے ڈنّ سے سوراب تک کے خطّے کو ''براہو میروانیوں کا مُلک'' کہا

ہے۔قلات پر ان کا کوئی دعویٰ کبھی بھی نہیں رہا ہے۔اس لئے یہ کہنا کہ قلات پر میر عمر میروانی حاکم بن بیٹھا سراسر غلط اور دروغ گوئی ہے۔مرحوم میر گل خان نصیر نے جنہوں نے آخوند کے اسی کتاب کے اردو ترجمے کے صفحہ 12 پر لکھا کہ آخوند نے

''تاریخ نویسی میں جانبداری اور
بدنیتی سے کام لیا ہے۔''

اپنی تمام کتابوں میں بغیر آخوند کا حوالہ دیئے آخوند کی اسی فرضی کہانی کو بار بار اپنے نام سے دُہرایا۔اور آخوند کی دروغ نویسی کا پارٹنر بن گیا تھا۔لیکن اس کتاب کا ترجمہ کرتے وقت صفحہ 23 اور صفحہ 24 کے حاشیہ میں آخوند کی اسی کہانی کو غلط اور بے بنیاد قرار دیا۔

پھر آگے اسی کتاب کے صفحہ 26 کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:۔

''رند درہ بولان سے اور لاشاری درہ
مولا سے ہوکر کچھی کی طرف ضرور گئے مگر
انہوں نے جہلاوان اور سراوان کے باشندوں
سے کوئی تعرض نہیں کیا۔اگر ایسا ہوتا تو
بلوچی کے اُس دور کے اشعار میں اس

کا ذکر ضرور ہوتا۔"

میر گل خان کا کہنا بالکل بجا ہے کہ ایسی تاریخی لڑائی جس میں ایک تہائی بلوچستان کے قبائل ملوث ہوتے ہیں اور اسی جنگ کے نتیجے میں بیسویں قبیلے جنم لیتے ہیں جن کے جدامجد اس لڑائی میں طرفین کے اتحادی ہوتے ہیں کیوں کر بلوچی شاعری میں نظر انداز ہوتا ہے جو بالکل ہی ناممکن ہے ۔بلوچی شاعری کوئی ہندوستانی معاشقوں کی شاعری نہیں ہے بلکہ سراسر رزمیہ شاعری ہے جس میں کم ازکم دوسو چھوٹی اور بڑی لڑائیوں کے تفصیلی تذکرے ہیں ۔ چونکہ میروانی اور رندوں کے درمیان جہلاوان اور سراوان میں کسی قسم کی لڑائی وقوع پذیر ہوئی ہی نہیں ہے اس لئے بلوچی شاعری اس جھوٹے تذکرے سے خالی ہے ۔حقیقی لڑائی جدگالوں اور میروانیون کے مابین واقعتاً لڑی گئی تھی اس لئے بلوچی شاعری نے تفصیلی طور پر اس کو محفوظ کرلیا۔ اور شاعری بھی خود جنگ کے فریق میروانی قبیلہ کی ہے۔ جس نے آخوند اور دوسرے دروغ گو مصنفین کی مفروضات کو واقعتاً اور سنداً جھٹلایا ہے اور حقیقی تاریخ کو آشکار کیا ہے۔

میر چاکر رند کے والد میر شیہک اور میروانیوں کے درمیان لڑائی کا جھوٹ ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ میر عمر اور چاکر رند یا اس کے والد شیہک

ہمعصر نہیں تھے۔ سردار خان گشکوری نے اپنی کتاب ہسٹری آف بلوچ ریس اینڈ بلوچستان'' میں لکھا ہے کہ سردا رچاکر خان نے سبی جام نندہ سے 1486ء میں لیا۔ کتاب ''چاکر اعظم'' میں یہی مصنف لکھتے ہیں کہ بیگر رند اور امیر ذوالنون کی بیٹی گراناز کے معاشقے کے نتیجے میں رندوں اور قندہاری لشکر کے درمیان درہ بولان میں لڑائی چھڑ گئی تھی۔ اس وقت سردار چاکر خان بھر پور جوانی میں تھے۔ یہ سال 1495ء تھا۔ رندوں اور لاشاریوں کے درمیان لڑی جانیوالی لڑائیوں کے دوران ایک لڑائی میں ہرات کے حاکم سلطان شاہ حسین نے لاشاریوں کے خلاف سردار چاکر خان کی مدد کو لشکر بھیجا۔ مشترکہ لشکر نے لاشاریوں کا قتل عام کیا۔ یہ سال 80-1470 کے درمیانی سال تھے۔ ''کتاب بلوچستان رپورتاژ'' میں کہا گیا ہے کہ سردار چاکر خان رند، لاشاریوں کو شکست سے دوچار کرنے کے بعد 1512ء کے شروع میں سبی سے ملتان کی طرف چلا گیا۔ میر خدا بخش بجارانی نے اپنی تصنیف ''قدیم بلوچی شاعری'' میں کہا ہے کہ سردار چاکر رند، رند لاشار لڑائی کے اختتام پر 1545ء کے قریب ہندوستان چلا گیا۔ تاریخ بلوچستان میں ہیتو رام نے لکھا ہے کہ 1540 میں میر چاکر رند، اپنے رند لشکر کے ہمراہ ہمایوں بادشاہ کی مدد کو موجود تھا اور ہمایوں نے شیر شاہ سے 1556ء میں دہلی

لے لیا۔اپنی دوسری کتاب ''بلوچستان ،تاریخ کے آئینے میں'' کے صفحہ 232 پر وہ ''تاریخ شیر شاہی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیر شاہ سوری نے اپنے جنرل ہیبت خان نیازی کو 1540ءمیں میر چاکر رند سے گفت وشنید کرنے کا حکم دیا۔سردار خان گشکوری کے مطابق سردار چاکر خان رند کا انتقال 1550ء سے 1555ء کے درمیان ہوا۔

اب آیئے میر عمر میروانی کے زمانے کی طرف۔ میر عمر ،میر بجار براہو کا باپ تھا۔جب جدگالوں کے حملے میں میر عمر اپنے بھائی قلندر کے ساتھ مارا گیا تو ملک بجار کم سن تھا۔جسے اُس کی ماں بی بی ماہناز حملے سے بچاتے ہوئے اپنے رشتہ داروں کے پاس پشین لے گئی۔نظم کے مطابق وہ پشین میں اٹھارہ سال تک رہی ۔جب تک بجار جوان ہوگیا۔بجار نے جدگالوں سے انتقام لینے کے لئے ماں سے اجازت لی اور سوراب چلا آیا۔اور دیگر میروانیوں کی مدد سے جدگالوں سے لڑنے کی تیاری کی۔اس لڑائی کے لئے اُس نے اپنے دیگر رشتہ داروں اور ہمسایہ قبائل سے مدد مانگی ۔قلات سے سابق حکمران خانوادے نے میر احمد ایلتازئی (جدامجد احمد زئی خوانین)اور میر کمبر کہدائی کی سرکردگی میں لشکر مہیا کیا۔کئی لڑائیاں لڑنے کے بعد براہو میروانیوں کو فتح حاصل ہوئی اور میر

بجار نے جنگ کے اختتام پر مقبوضہ اراضیات کو اتحادیوں میں تقسیم کیا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں اُس کے اتحادی میر احمد ایلتازئی کو کرد مستونگ سے قلو خضدار تک کا علاقہ جنگی خدمات کے عوض دیا گیا۔ جہاں پر وہ حاکم ہوا۔ میر احمد کے بارے میں تمام محققین کا اتفاق ہے کہ وہ 1666ء میں قلات کے خان بنے۔ میر گل خان نصیر کے مطابق اُس کا انتقال 1695ء میں ہوا۔ اس کا واضح مطلب یہی ہوا کہ براہو جدگال جنگ 1665ء کے آس پاس اختتام پذیر ہوئی تھی۔ میر بجار کی کم سنی کو اگر نو دس سال مانا جائے تو پشین میں اٹھارہ سال کے بعد اُس کی عمر 28 اور 30 سال کی ہوگی۔ بھرپور لڑائی کے دوران اگر ہم اُسے 35 سال کا تسلیم کرلیں تو میر عمر کے قتل کے سن کو 1630ء اور 1635ء کے درمیان مانا جائے گا جو سردار چاکر خان رند کی جوانی کے زمانہ سے تقریباً ایک سو پندرہ سے ایک سو چالیس سال تک بعد کا زمانہ ہے جو اس لڑائی کی کہانی کا مبنی بر جھوٹ ہونے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

رند میروانی لڑائی اور میر عمر میروانی کے قلات پر قبضہ کرنے کی جھوٹی اور من گھڑت کہانی لکھنے کے بعد آخوند نے بی بی ماہناز کے بارے میں بھی فرضی کہانی گھڑی۔ لکھتے ہیں:-

''میر عمر میروانی کے قتل کے وقت
اُس کا بیٹا کم سن تھا۔اُس کا نام
بجار تھا۔اُس کی والدہ اُسے ساتھ
لے کر مستونگ چلی گئی ۔وہاں پر بجار
کی والدہ نے خواجہ خیل قبیلہ کے کسی
فرد سے شادی کی۔(صفحہ 25-24)۔

اس بے بنیاد کہانی کو اکثر مصنفین نے اور خاص کر مرحوم میر گل خان نصیر اور ملک سعید دھوار نے خوب پبلسٹی دی۔اور اسے بار بار دُھرا کر سچ بنانے کی کوشش کی۔جسے مذکورہ رزمیہ داستان نے مسترد کیا ہے۔

اور کہا ہے کہ بی بی ماہناز اپنے بچے ملک بجار کو لے کر پشین چلی گئی جہاں اُس کے رشتہ دار رہتے تھے۔یہ داستان اُس کے پشین میں رہائش کے عرصہ کو اٹھارہ سال بتاتی ہے جب تک اُس کا بیٹا بجار جوان ہو جاتا ہے۔رزمیہ داستان صاف طور پر بتاتی ہے کہ وہ پشین کے خواجہ سیدوں سے ہے۔خواجہ خیلوں سے نہیں ہے۔جو مستونگ کے دھوار ہیں۔نظم میں کہیں بھی خواجہ خیلوں کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ مستونگ جا کر رہنے کی بات ہے۔ماہناز کے مستونگ کے خواجہ خیلوں میں کسی سے شادی کی بات بھی آخوند کی غلط بیانی

ہے کیونکہ ایک تو نظم میں اس بات کا اشارہ تک نہیں ہے اور اس کے علاوہ اُس کی کوئی اولاد ماسوائے بجار براہو کے نہیں ہے جو دوسرے شوہر کی نسبت سے خواجہ خیل کہلاتی ہو۔

اسی کتاب میں آگے آخوند میر بجار کی سوراب کی طرف جانے اور اپنے دشمنوں سے اپنے باپ اور قبیلے کا انتقام لینے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''میر بجار جب بڑا ہوا، انتقام کا
جذبہ اُس کے سر چڑھا۔ خواجہ خیلوں
سے اُس نے جانے کی اجازت طلب
کی۔ خواجہ خیل چوں کہ کمزور لوگ تھے۔
اُسے امداد دینے اور اُس کی حمایت
کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اُسے
جانے کی اجازت دے دی۔ ایک گھوڑا،
اسلحہ اور کچھ نقد رقم بھی انہوں نے
اُسے دی۔'' (صفحہ 25)۔

مذکورہ رزمیہ نظم کا بیان، آخوند کے مندرجہ بالا بیان کو بھی قبول نہیں کرتا۔ نظم کے مطابق ایک دن بجار نے انتہائی افسردگی کے عالم میں اپنی ماں بی بی

ماہناز سے کہا کہ دشمنوں نے عمر ولد میرو کو قتل کر کے ڈنّ سے سوراب تک کے براہو ملک کو برباد کر دیا اور میرے عزیز واقرباء کو اپنے علاقوں سے دربدر کر دیا ہے۔ان میں سے اکثر جدگال سے انتقام لینے کے لئے بے چین ہیں۔ بربادی اور تباہی کے اس واقعہ نے میرے منہ پر کالک مل دی ہے۔اب میں اس عاجزانہ زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔یا تو میں اپنے باپ اور قبیلے کے انتقام میں سوراب اور نغاڑ کو جدگالوں کی نعشوں سے بھر دوں گا یا پھر باپ کے نقش قدم پر چل کر جان دوں گا۔

نظم کے مطابق اُس کی ماں نے یہ باتیں سُن کر بجار کو سوراب کی طرف جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا کہ اپنی تلوار کمر سے باندھ لو اور سوراب جا کر اپنے باپ کے وفادار غلام گوشو سے مل لو اور اپنے منصوبے سے اُسے آگاہ کرو اور اُس کی ہدایات پر عمل کرو۔

براہو جدگال جنگ کی یہ رزمیہ داستان میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ بجار خواجہ خیلوں کے پاس تھا، یا اُس نے اپنا مُدعا خواجہ خیلوں سے بیان کیا۔ بلکہ جیسے کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ پوری رزمیہ داستان میں کہیں بھی مستونگ اور خواجہ خیلوں کا ذرہ بھر تذکرہ نہیں آتا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس پوری کہانی میں خواجہ خیلوں کا کوئی کردار نہیں رہا ہے۔اور آخوند کا قلم

بلا مقصد اور غلط طور پر خواجہ خیلوں کے حق میں استعمال کیا گیا ہے۔
آخوند محمد صدیق کی یہ فرضی کہانی یہاں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ آگے اسی دروغ گوئی کے ساتھ چلتی ہے۔ مزید لکھتے ہیں:۔

"میر بجار انتقام لینے کے ارادے سے جب منگچر پہنچا تو وہاں پر کچھ زمیندار اپنے کھیتوں میں پانی دے رہے تھے۔ میر بجار نے اُن سے مندو حاکم قلات کا حال پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ زمینداروں نے بتایا کہ مندو قلات پر حکومت کر رہا ہے۔ میر عمر مارا گیا ہے اور دوسرے تمام میروانی دربدر و خراب و خوار ہو گئے ہیں۔ میر عمر کا بیٹا بجار مستونگ میں خواجہ خیلوں کے پاس پڑا ہوا ہے۔ اُن سے روٹی کے ٹکڑے لے کر کھاتا ہے۔ تب میر عمر کے بیٹے بجار نے کہا کہ بجار میں ہوں اور اپنے باپ کے خون

کا انتقام لینے کے لئے آیا ہوں۔

زمینداروں نے بجار سے کہا کہ اس تمام

علاقے میں بلوچ پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنا

نام ظاہر نہ کرو کہ مارے جاؤ گے۔ اُس

نے زمینداروں سے کہا کہ تم لوگ کیا مشورہ

دیتے ہو۔ انہوں نے بجار سے کہا کہ سیاہی

اور اُس کے بیٹے قلات کے قریب چھپر میں

رہتے ہیں۔ سیاہی، رئیس کا بیٹا ہے اس لئے ان

کو رئیسانی کہتے ہیں۔ تم اُس کے پاس جا کر اپنے

کام کے لئے اُس سے مشورہ کرو۔" (ص 25، ص 26)۔

مذکورہ رزمیہ داستان آخوند کے اس قصے کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ کہتی ہے میر بجار اپنے جدگال دشمنوں سے انتقام لینے کے ارادے سے اپنی ماں سے اجازت لے کر سوراب کے لئے روانہ ہوا۔ بی بی ماہناز نے اُسے سوراب میں اپنے خاندانی وفادار غلام گوشو کو تلاش کرنے اور اُس سے مشورہ کرنے اور جنگ کی منصوبہ بندی کرنے کی ہدایت کی۔ اُسکی ماں نے اُسے گوشو کو پہنچاننے کے لئے گوشو کی خاص خاص نشانیاں بھی بتا دیں۔ پھر یہ

کیسے ممکن ہے کہ میر بجار اپنے معلوم دشمنوں کے پیچھے جانے کی بجائے منگچر میں ٹھہرے۔ اور جدگالوں کو چھوڑ کر رندوں اور حاکم قلات کے بارے میں پوچھتا پھرے اور وہ بھی ہر خاص و عام سے۔ جن کی قومیت تک کا اُسے پتہ نہ تھا۔ پھر آخوند کی زبانی، منگچر کے زمیندار اُسے قلات کے چھپر میں سیاہی ولد رئیس کا بتاتے ہیں کہ اُس سے مشورہ کرو۔ جبکہ سیاہی اُس کے قبیلہ کا بھی نہیں ہے۔ ڈیڑھ دو سو سال بعد مصنفین سیاہی کو رند قبیلہ سے لکھتے ہوئے اس کا سارا شجرہ بتاتے ہیں تو کیا میر بجار اور اس کے قبیلہ یا خاندان والوں کو معلوم نہ ہوا ہوگا کہ سیاہی رند قبیلہ سے ہے۔ اور اگر بجار کے دشمن رند ہیں تو پھر وہ سیاہی سے کیوں کر بچ کر زندہ لوٹے گا۔ دراصل ساری کہانی من گھڑت ہے اور رزمیہ داستان ہی اصل حقائق سے پردہ اٹھارہی ہے۔

آخوند صاحب کی مزید گل افشانیاں دیکھئے:۔

> ''منگچر سے میر بجار سیاہی خاندان کے
> پاس گیا۔ جب وہاں پہنچا تو ظاہر کیا کہ
> میں ہی میر عمر میروانی کا بیٹا ہوں اور
> میرا نام بجار ہے۔ تمہارے پاس اس لئے
> آیا ہوں کہ میری مدد کرو اور قلات پر

قبضہ کر کے اُسے میرے سپرد کردو۔ سیاہی
نے بجار کے جواب میں کہا کہ قلات کے
حاکم کے خلاف سیالداری کی لڑائی میں
نہیں لڑسکتا ۔لیکن آپ کو بھی اپنے گھر
سے نہیں نکال سکتا۔اور نہ ہی لشکر جمع
کر کے قلات پر حملہ کرنے کو آپ کے
ساتھ آسکتا ہوں ۔البتہ اگر کبھی قلات
کا حاکم لشکر لے کر آپ کو گرفتار کرنے
اور مارڈالنے کو آئے تب میں اپنا سر
کٹوا دوں گا۔لیکن آپ کو گرفتار کرنے
اور مارنے نہیں دوں گا۔(صفحہ 26)۔

رزمیہ نظم ایسی بے سروپا باتوں سے خالی ہے۔ نہ وہ رندوں کو میروانیوں کا دشمن کہتی ہے اور نہ بجار کا کسی سیاہی سے بات اور مشورہ کرنے کا تذکرہ کرتی ہے ۔نظم میں نہ سیاہی کا ذکر ہے نہ رئیس اور رئیسانی کا ۔جیسے کہ اوپر کہا گیا کہ بجار اپنی والدہ کی ہدایت کے مطابق سوراب کو روانہ ہوا۔آخوند نے اپنی خودساختہ کہانی میں کہا ہے کہ سیاہی اور بیٹوں نے میر بجار کو کسی قسم کی مدد

دینے سے انکار کیا تھا۔لیکن اس کے باوجود لکھتے ہیں؛

''بعدازاں میر بجار ،سیاہی اور
اس کے بیٹوں نے آپس میں سازباز
کی ۔ایک لشکر ساتھ لے کر منگچر سے
مندو کے اونٹوں کے گلے کو ہانک
لائے ۔مندوانیوں کے لشکر نے راستے
میں اُن کو آلیا اور لڑائی واقع ہوئی
مندو کے لشکر کے چند نفر مارے گئے
باقی لشکر شکست کھاکر پسپا ہوا۔
سیاہی کے بیٹوں کی طرف سے چار
گھوڑے مارے گئے ۔سیاہی نے اپنے'
گھوڑوں کے لئے بہت افسوس کیا۔
یہاں تک کہ اپنے بیٹوں سے کہا
کہ کاش تم میں سے بھی ایک میرے
گھوڑوں کے ساتھ مارا جاتا ۔بجار نے
سیاہی سے کہا کہ اگر حق تعالیٰ نے مجھے

قلات دلادیا تو انشااللہ تمہارے
گھوڑوں کا عوض تم کو دیا جائیگا۔"
(صفحہ 26وصفحہ 27)۔

حیرت ہے جب سیاہی نے میر بجار کو مدد کرنے کے بارے میں کوراسا جواب دیا تھا تو پھر اچانک وہ بجار کے ساتھ کیوں کر ساز باز میں شامل ہوئے اور پھر بجائے قلات جا کر مندورند حاکم قلات سے لڑتا، سیدھا واپس منگچر جا کر مندوانیوں کے اونٹوں کے گلے چُرالائے۔ یہ عجیب مورخ ہے ایک جگہ بجار کو ایک قبائلی منتقم اور سردارزادہ بتاتا ہے جو جدگال دشمنوں کو جانتے ہوئے رند حاکم قلات کو قتل کرنے اور قلات کا حاکم بننے کا خواہشمند ہے دوسری جگہ اُسے ایک ڈاکو اور چور بتاتا ہے جو حاکم قلات سے لڑنے کی بجائے منگچر ڈکیتی ڈالنے چلا جاتا ہے۔ پھر جب لڑائی میں سیاہی کے گھوڑوں کو مرتا ہوا بتاتا ہے وہاں پر ایک سنگدل اور لالچی باپ کے روپ میں سیاہی کو پیش کرتا ہے جسے اپنی اولاد سے ایک گھوڑا زیادہ عزیز ہے۔ جو کہتا ہے کہ گھوڑوں کے بدلے بیٹے کیوں نہیں مرے۔ انسانی نفسیات کو اس شکل میں پیش کرنا کسی اجڈ گنوار شخص کا کام شاید ہو مورخ اور قلمکار کا کام نہیں ہوسکتا۔ مذکورہ رزمیہ داستان ایسی بے سروپا اور لغو حکایات سے خالی

ہے۔لیکن آخوند صاحب کی لغویات ختم نہیں ہوتیں:۔

"پھر ایسا ہوا کہ براہوئی قبائل جو پہاڑوں میں منتشر ہوچکے تھے میر بجّار اور رئیس سیاہی کے پاس جمع ہوئے ۔اور بلوچ قبائل مندو کے پاس جمع ہوچکے تھے ۔میر بجّاراور سیاہی نے دھوم دھام سے لڑائی کے لئے قلات کا رُخ کیا ۔ان کے درمیان شہر سے باہر لڑائی ہوئی ۔مندو مارا گیااور بلوچوں کے لشکر کو شکست ہوئی ۔مندو کی قبر قلات کے قلعہ کے اُس دروازے کے سامنے موجود ہے جو مستونگی دروازہ کہلاتا ہے ۔بعدازاں میر بجار نے علاقہ سوراب ووڈھ میں بلوچوں کو قتل کیا اور قبیلہ مینگل کو وڈھ میں بٹھایا ۔وڈھ میں ایک علاقہ ہے جسے وہیر کہتے ہیں

وہ رئیسانیوں کو دیا۔ جو سیاہی
زہی کہلاتے ہیں۔ اب تک وہیر کا علاقہ ان
کے پاس ہے۔ قلات کے جوئے دو
دران سے چار شبان آب مع زمین
سیاہی رئیس کے بیٹوں کو ان کے
چار گھوڑوں کے عوض میں اور چھپر کی
اراضیات کا بہ بھی ان کو دیئے۔ یہ
اراضیات اور جوئے دودران سے تھوڑا سا
حصہ اب تک ان کے پاس ہے۔'' (صفحہ 27 وصفحہ 28)۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا کہ یہ آخوندی لغویات ہیں کہ نہ جن کی زبانی روایات دستیاب ہیں اور نہ مذکورہ تاریخی داستان میں ان کہانیوں کو جگہ دی گئی ہے۔ آخوند نے میر بجار اور رئیس سیاہی کے پاس ''پہاڑوں میں منتشر ہونے والے براہوئیوں'' کے جمع ہونے کی بات کی ہے۔ جو براہوئی تشکیل سے ان کی عدم واقفیت ثابت کرتی ہے۔ میر بجار اور جدگال قبائل کے درمیان ہونے والی لڑائی کے دوران براہوئی نام'' یا اصطلاح وجود نہیں رکھتا تھا۔ اور ہر قبیلہ اپنے اصل نام سے پہچانا جاتا تھا۔ صرف میر بجار کا طائفہ ''براہو

''شہرت رکھتا تھا اور براہو کا لفظ میروانی کے ساتھ استعمال ہوتا تھا۔ جیسے بجار براہو میروانی، عمر براہو میروانی، میرو براہو میروانی وغیرہ۔ براہوئی اصطلاح جنگ کے اختتام پر مقبوضات کی تقسیم اور براہو میروانیوں کے اتحادی لشکروں کے سرکردہ اشخاص کی، اُن کی نسبت سے تشکیل پانے والے نئے قبیلوں کے نئے سردار کی حیثیت سے دستار بندی کے وقت مروج ہوا۔ یہ نئے سرداراوران کے نوتشکیل شدہ گروہ یا طائفے میروانی سردار گھرانہ ''براہو'' کے اتحادی ہونے کی بنا پر نئے نام ''براہوئی'' سے معروف ہوئے۔ اس اتحادیہ کا چیف سردار میر بجار براہو میروانی مقرر ہوا۔ جسے اتحادیہ کے نئے قبیلوں کے نئے سرداروں نے باری باری دستار بندی کی۔ یہ تمام اتحادی سوراب کے نغاڑ میں جمع تھے۔ نہ بجار قلات میں تھا نہ قلات میں ان دنوں براہوئی اصطلاح مروج تھی۔ قلات کا پہلا براہوئی خان سابق خوانین بلوچ کا ایک شاہزادہ میر احمد ایلتازئی ہوا جو میر بجار براہو کا رشتہ دار اتحادی تھا۔ جسے کھڈ مستونگ سے قلعہ خضدار تک'' کا علاقہ جنگی خدمات کے عوض دیا گیا۔ وہ بھی اس لئے کہ اس خطے کے درمیانی اکثر علاقے اُس کے معزول خوانین اجداد کی بالادستی میں رہے تھے۔ تحریری دنیا میں لفظ ''براہوئی'' کا سب سے پہلا استعمال اٹھارویں صدی عیسوی میں سندھ کی

تاریخ ''تحفۃ الکرام (فارسی) بخش اوّل ،جلد سوئم کے صفحہ 422 پر خان عبداللہ خان کے لئے کیا گیا ہے ۔اور اُسے ''براہوئی خان'' لکھا ہے۔ کتاب میں اُن کا شجرہ نسب یوں درج کیا گیا ہے:-

''عبداللہ خان بن سمندر خان بلوچ بروہی

زمیندار عمدہ سرحد قندھار۔''

آخوند کا یہ کہنا کہ دوسری طرف بلوچ قبائل میر مندو حاکم قلات کے پاس جمع ہو چکے تھے غلط ہے آخوند نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ بلوچ سے ان کی مراد کن قبائل سے ہے۔قبائل تو سارے بلوچ تھے ۔بجار بھی میروانی بلوچ تھا۔جس کا مدمقابل جدگال قبائل تھے اور وہ بھی غیر بلوچ نہیں تھے صرف سندھی زبان اپنانے کی وجہ سے جدگال کہلاتے تھے ۔دراصل آخوند نے لفظ بلوچ کا استعمال رند قبائل کے لئے کیا ہے لیکن اُس زمانے میں وہ بلوچ سے زیادہ رند ہی کہلاتے تھے ۔بہر حال آخوند کا یہ لکھنا کہ رند قبائل وغیرہ مندو کے پاس جمع ہو چکے تھے بھی ایک بے بنیاد اور من گھڑت بات ہے۔جب میر بجار کی لڑائی مندو سے ہوئی ہی نہیں ہے۔تو رندوں کا مندو کے پاس جمع ہونا ایک جھوٹی کہانی ہے ۔مندو رند سردار چاکر کے

زمانے میں قلعہ نیچارہ پر حاکم تھا اور قلات سیوا اُس کے حلقہ اقتدار سے
الگ تھا۔ وہ زمانہ، میر بجار کے زمانے سے تقریباً ایک سو چالیس سال قبل کا
زمانہ ہے۔ جب میر بجار اور مندو ہمعصر ہی نہیں تھے تو لڑائی کیوں کر
ہوئی۔ میر مندو کو نیچارہ قلات کی حاکمیت سے میر کمبر رئیس نے مذاکرات
کے ذریعہ دستبردار کرایا تھا۔ چوپھر سردار چاکر خان کے پاس پنجاب چلا گیا
جہاں شیر شاہ کے حکم سے بیبت خان نیازی نے اُسے قتل کرادیا۔

آگے آخوند صاحب لکھتے ہیں کہ میر بجار اور مندو رند کے لشکروں
کے مابین لڑائی ہوگئی اور میر مندو مارا گیا۔ پھر وہ میر مندو کی قبر کی نشاندہی
کر کے کہتے ہیں کہ قلات کے قلعہ کے اُس دروازے کے سامنے جو مستونگی
دروازہ کہلاتا ہے، موجود ہے جبکہ اسی قبر کو ملک سعید دہوار اپنی کتاب ''تاریخ
بلوچستان'' مطبوعہ بلوچی اکیڈمی (2007ء) کے صفحہ 419 پر ''میر عمر
میروانی'' کا بتاتے ہیں اور اسی کتاب کے صفحہ 438 پر اسے ''میر مندو'' کا
لکھتے ہیں۔ دونوں حوالے انہوں نے آخوند محمد صدیق کی اسی کتاب یعنی
اخبارالابرار کے دیئے ہیں جبکہ آخوند نے اپنی کتاب میں میر عمر میروانی کے
قبر کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

قلات کے قلعہ کے شمالی سمت کے قدیم قبرستان میں کسی میر مندو

سے منسوب قبر موجود تو ہے لیکن اُس کی لڑائی میر بجار سے غلط کہانی ہے۔ اُسے میر بجار کے زمانے سے تقریباً ایک سو چالیس سال پہلے بلفت جدگالوں نے اپنے دو مقتولوں کے عوضانے میں قتل کر دیا تھا۔ یہ میر مندو سابق حاکم قلات نہیں تھا۔ بعض اسے بھی پُھرو کہتے ہیں اور بعض اسے ''سیاہ پھاد'' قبیلے سے بتاتے ہیں۔

پھر آگے آخوند اپنی لغویات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے سوراب اور وڈھ میں بلوچوں سے لڑائی کی بات کرتے ہیں۔ جس کے جواب میں اُس کی کتاب کے مترجم میر گل خان نصیر اسی کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ آخوند کی بات صحیح نہیں ہے۔ اُن دنوں سوراب اور وڈھ میں جدگال آباد تھے۔ اور تمام جھلاوان پر جدگال قابض تھے۔ براہوجدگال جنگ کی نظم میں بھی اسی کی تصدیق کی گئی ہے۔ نظم میں کہا گیا ہے کہ میر بجار نے وڈھ اور ناچ تک جدگالوں کو تاراج کیا۔ جنہوں نے علاقہ خالی کر دیا۔ پھر آخوند لکھتے ہیں کہ میر بجار نے وڈھ میں مینگل کو بٹھایا اور وہیر کا علاقہ رئیسانیوں کو دیا۔ جبکہ رزمیہ داستان آخوند کی اس بات کو بھی جھٹلاتی ہے اور کہتی ہے کہ میر بجار نے جنگ کے اختتام پر وڈھ کی مقبوضات ملک دوستین نوشیروانی کو خدمات کے عوض دیئے جن کا بیٹا ملک دینار جدگالوں کے ہاتھوں دوران

جنگ قتل ہو چکا تھا۔ اور وہیر سے لے کر درا کالہ اور لک باراں سے ...
تک کی مقبوضات کی نائبی تیمر ولد یوسف ہوتک رخشانی کو دی گئی۔ جو میر
بجار کا اتحادی تھا۔ تیمر اور ناچ کے قبیلہ تمبرانی کا جدامجد تھا۔ نظم نہ کسی سپاہی
کی بات کرتی ہے اور نہ وہیر کا علاقہ رئیسانیوں کو دینے کا تذکرہ کرتی ہے۔
اور نہ اس میں جوئے دودران اور چھپر کی اراضیات کا ذکر ہے۔ میر گل خان
نصیر نے بھی کتاب کا ترجمہ کرتے وقت صفحہ 28 کے حاشیہ میں لکھا:-

"براہو جدگال جنگ" کے عنوان سے
جو مشہور بلوچی نظم موجود ہے اور جس
میں جدگالوں کو شکست دینے کے
بعد میر بجار نے اپنے براہوئی قبائل
میں جس طرح مفتوحہ علاقے کو تقسیم کیا
اس میں وہیر کا علاقہ رئیسانیوں کو دینے کا ذکر نہیں ملتا"۔

نظم میں آخوند کے کہنے کے برعکس مینگل قبیلہ کو وڈھ میں بٹھانے کی بات
نہیں کی گئی ہے اور نہ کہ مینگل (وڈھ کے شاہی زئی مینگل) اس لڑائی میں
میر بجار کے اتحادی تھے۔ نظم میں ذگر مینگلوں (دیکھئے اشاریہ نمبر 34) کا
تذکرہ کیا گیا ہے۔ جنھیں شاعر میروانیوں کا ہم نسل اور رشتہ دار کہتا ہے جو

دوران جنگ دشت گوران سے نوشکی جا چکے تھے۔آخوند محمد صدیق نے اخبارالابرار میں بجار کے بارے میں تمام تر مفروضوں اور خود ساختہ واقعات کا تذکرہ کیا ہے جنہیں اس رزمیہ داستان نے مسترد کر کے حقیقی کہانی بیان کی ہے۔آخوند نے لکھا ہے کہ:-

''میر بجار نے قلات پر قبضہ کرلیا لیکن
بعد میں اُس نے بادیہ نشینی اختیار کی۔
یہاں تک کہ بادیہ نشینی کی حالت میں ہی
فوت ہوا۔قلات بغیر حاکم کے رہ گیا''
(تاریخ خوانین قلات'' ترجمہ گل خان نصیر
صفحہ 28)

مذکورہ رزمیہ داستان کے بجار سے متعلق واقعات ہم بیان کر چکے ہیں کہ جنگ کے اختتام پر اُسے نئے اتحادیہ ''براہوئی'' کا چیف سردار مقرر کیا گیا۔قلات تو تقسیم کے مطابق میر بجار براہو کے اتحادی ''میر احمد ایلتازئی کو دیا گیا جو 1666ء میں بحیثیت خان بلوچ،گدی پر بیٹھا۔وہ بانی خوانین بلوچ میر کمبر رئیس کے سلسلے کا آٹھواں خان اور جدید اتحادیہ ''براہوئی'' کا پہلا خان ہوا۔میر بجار نہ کبھی قلات میں رہا تھا اور نہ قلات

کے اقتدار پر اُس کا دعویٰ تھا اور نہ کبھی وہ قلات کا خان یا حاکم ہوا تھا۔ اُس کی موجودگی اور نگرانی میں میر احمد، خانی کے منصب پر فائز ہوا۔ اور اپنے نام سے بننے والے نئے قبیلہ احمد زئی کا جدّ بنا۔ لہذا آخوند کا یہ کہنا کہ قلات بغیر حاکم کے رہ گیا ایک مفروضہ ثابت ہوا ہے۔

میر گل خان نصیر نے اپنی تاریخ بلوچستان، قدیم وجدید ''تاریخ کی روشنی میں'' کے صفحہ 148 پر لکھا ہے کہ میر بجار لاولد مرا اور اس کے بعد قوم کی سرداری میر کمبر کو ملی جبکہ میروانی سردار گھرانے کے نسب نامہ سے مصنف کا بیان غلط اور ایک مفروضہ ثابت ہوتا ہے۔ مشکئے کا گاؤں منگلی میروانی سردار کا مرکز ہے۔ جو سوراب کے اسی میر بجار میروانی کے براہوطائفہ کے پسماندگان ہیں۔ میروانی سردار قادر بخش مرحوم نے یہ شجرہ نسب عنایت کیا تھا۔ جس میں میر بجار کا بیٹا سردار دوستین کا نام دیکھا جاسکتا ہے:۔

''سردار قادر بخش ولد سردار نصراللہ ولد
سردار موسیٰ خان ولد سردار ملک دینار ولد
سردار عبدالکریم ولد سردار فیروز ولد سردار
بھائیاں ولد سردار میاولد سردار فقیر محمد
ولد سردار دوستین ولد سردار میر بجار

براہو ولد میر عمر براہو ولد سردار
میر وخان براہو میروانی رئیس ہے"

اس طرح مذکورہ نظم نے براہوئی تاریخ کا واحد ماخذ ہونے کی حیثیت سے دروغ نویس مورخین کو تاریخ کے کٹہرے میں کھڑا کر کے انہیں بے نقاب کرتے ہوئے براہوئی تاریخ کو حقیقی معنوں میں بیان کر دیا ہے۔ اور اس موضوع پر مفروضوں کے انبار کو بے بنیاد، من گھڑت، اور بے وقعت بنا دیا ہے۔

نمرود ------حقیقتاً بلوچ تھا

بلوچی دنیا جنوری 2004ء میں ''کیا نمرود بلوچ تھا'' کے عنوان سے جناب انور قحطانی کا ایک بے ترتیب مضمون پڑھنے کو ملا۔اس موضوع کی ذیل میں اُنھوں نے دو تین دیگر نکات پر بھی مختصراً خیال آرائی کی ہے ۔چاہئے تو یہ تھا کہ انور قحطانی نمرود ہی پر ایک مفصل تحقیقی مضمون سپرد قلم کرتے تاکہ اس کے جواب میں بھی کہیں سے کوئی تحقیقی مواد سامنے آجاتا اور نمرود کی قومی حیثیت پر سیر حاصل بحث ہوتی لیکن انہوں نے چند اشارات سپرد قلم کر کے فیصلہ صادر کر دیا کہ نمرود بلوچ نہیں تھا۔

یہاں فی الوقت ہم جناب انور قحطانی کی پیروی کرتے ہوئے نہایت مختصر طور پر محققین اور بلوچ سرزمین کے حوالہ سے ثابت کریں گے کہ نمرود بلوچ تھا۔نہ صرف وہ بلوچ تھا بلکہ اسی سرزمین کا مگر اللہ کی واحدانیت کا منکر اور گستاخ باشندہ اور سپوت تھا جس کے جناب انور قحطانی باشندہ ہیں۔

بنی اسرائیل کے صحیفے اسیحہ نبی (۱۴:۱۳۔۱۴) میں اسیحہ نبی نمرود کو فرزند

سحر کے لقب سے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

''افسوس! اے روشن صبح کے فرزند! تم جو قوموں کو ملیامیٹ کرنے والے مشہور تھے کس طرح بلندیوں سے گرائے گئے۔ تم نے تو ارادہ باندھا تھا کہ آسمان پر چڑھ کر اپنے شاہی تخت کو خدا کے ستاروں سے بھی بلند تر لے جاؤں گا اور پہاڑوں پر بیٹھ کر عظیم تر ہستی کی مانند بن جاؤں گا مگر کیسے زمین پر پھینک دیئے گئے''۔

اسیحہ نبی کے اس قول کی تفسیر میں بنی اسرائیل کے علماء نے لکھا ہے کہ نمرود پہلا کلدانی بادشاہ تھا جسے نمرود بیلوص کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ بیلوص یا بعلوص، ایرانی اور مکرانی (موجودہ بلوچی) میں بلوچ کہلاتا رہا ہے۔

شیخ محمد اکرم کردستانی نے اپنی مشہور کتاب ''تاریخ مردوخ'' میں لکھا ہے کہ:۔

''سمی رامس، بیلوص (یعنی نمرود بیلوص) کی بیٹی تھی جس نے ہندوستان پر لشکرکشی کی اور دریائے سندھ سے پار گئی لیکن ہندوستان کے بادشاہ نے اپنے ہاتھیوں کی فوج کی مدد سے اسے شکست دیدی۔ سمی رامس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا بیلوص دوئم تخت پر بیٹھا۔''

ایک انگریز مسٹر رالنسن نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ:۔

''بیلوس بابل کا بادشاہ گزرا ہے اور یہ وہی شخص تھا جس کا ذکر کتاب مقدس میں نمرود بن کوش کے نام سے ملتا ہے۔ نمرود بابل کا مہادیو لنگھم دیوتا تھا۔اس کو بیکوش بھی کہتے تھے۔جو دراصل لفظ ''برکوش'' کی بگڑی ہوئی صورت ہے ''برکوش'' کے معنی ہیں۔''کوش کا بیٹا''۔چنانچہ علما بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ ''برکوش'' یہی نمرود تھا جو چیتے کی کھال پہنتا تھا۔ چیتے کو عبرانی اور کلدانی زبانوں میں ''نمر'' کہتے ہیں پس نمرود کے معنی ''چیتے کو زیر کرنے والا'' کے ہوتے ہیں۔''

اپنی مشہور تاریخ ''بلوچ اور بلوچستان''میں جناب سردار خان بلوچ نے قدیم محققین کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ''بیلوس کلدانیوں کا عظیم دیوتا ،سورج دیوتا تھا۔اسی مناسبت سے کلدانیوں کا بادشاہ نمرود ،اپنے کونمرود بیلوس کہلواتا تھا''

تاریخی کتابیں بتاتی ہیں کہ نمرود نے خدائی کا دعوی کیا اور اس کی قوم کے لوگ اسے دیوتا ماننے لگے۔اور اس کے بت بنا کر مندروں میں رکھنے اور انہیں پوجنے لگے پھر یہ مندر نمرود بیلوص کی نسبت سے مندر بیلوص مشہور ہوئے۔

جناب سردار خان بلوچ نے اپنی تاریخ میں مزید لکھا ہے کہ:-

''انجیل میں نمرود کو کوش کا بیٹا کہا گیا۔ نمرود کو نمرود بلوص اور شہر نمرود کو شہر بلوص کہتے تھے۔ نمرود کو ایک مجازی خدا یا دیوتا مانا جاتا تھا۔ نمرود ہی پہلا کلدانی نسل بادشاہ تھا۔ جسے بلوص کہا جاتا تھا۔ کوچ کلدانی نسل کی بادشاہت تقریبا سولہویں اور سترہویں صدی قبل مسیح کے درمیانی عرصہ میں زوال پذیر ہوئی''۔

معروف مورخ جسٹس میر خدا بخش خان بجارانی مری اپنی تاریخ ''بلوچستان تاریخ کے آئینے میں'' نمرود کے ضمن میں ''قدیم بادشاہت'' نامی تالیف کے حوالہ سے لکھتے ہیں:-

''لفظ بلوچ ، بالوس یا بلوص سے مشق ہے جو بابل کا بادشاہ تھا۔ یہ وہی ہستی ہے جسے کش یا کوش کا بیٹا نمرود بھی کہا جاتا ہے'' قدیم دور کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے۔ وہ قدیم مصنفین کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

''ہر قوم، ہر قبیلہ اور ہر شہر اپنے اپنے دیوتا یا اپنے اپنے خدا کی پرستش کرتا تھا۔ انہیں ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے مختلف خطابات سے نوازا جاتا تھا۔ کلدانیوں کا دیوتا بیلوص تھا۔ اور ان کا بادشاہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، اپنے آپ کو نمرود بیلوص کہلاتا تھا۔ نتیجتاً اس کے پیروکاروں نے بھی

یہی نام اپنایا تھا۔شہروں اور دریاؤں کے نام بھی اسی دیوتا کے نام پر رکھے جاتے تھے۔اس کے پیروکار بیلوص کہلاتے تھے جنہیں عرب مورخین نے بالوس کے نام سے یاد کیا ہے۔موجودہ زمانے میں بھی پٹھان بلوچوں کو بالوس ہی کہتے ہیں"۔

آگے لکھتے ہیں

"بلوچ کوشوں کی کونسل کے کلدانی قبیلے کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔پہلے کلدانی خاندان کا پہلا زبردست حکمران نمرود بلوس تھا۔اس کے بعد اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران شہنشاہ بلوس تھا۔جس نے 2130 ق م میں بابل پر حکومت کی تھی۔نمرود کو توریت کی کتاب "پیدائش" میں "زمین پر پہلا زبردست حکمران" کہا گیا ہے۔اسکینر توریت میں مذکور اس نمرود کے متعلق اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "وہ ایسی قومی ریاست کے قیام کے خیال کا بانی تھا جس کی طاقت فوج کی قوت پر ہو"

انسائیکلو پیڈ برٹانیکا جلد 19، دو بائبلز، قدیم اور بابل اعظم کا زوال نامی کتابوں میں نمرود کے بارے میں چند ایک صفات کا تذکرہ اس طرح ہے:۔

☆نمرود نام کے معنی ہیں ۔چیتے کو زیر کرنے والا ،یہ دو عبرانی ''نمر''اور''ردا'' کا مجموعہ ہے۔

☆یہودی انسائیکلو پیڈیا میں ان کے نام کا ترجمہ،''وہ جس نے تمام مخلوق کو یہواہ خدا سے باغی کر دیا۔'' کیا گیا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے اب تک نمرود جیسا طاقتور انسان ،عظیم شکاری اور یہواہ خدا سے بغاوت کرنے والا کوئی اور پیدا نہیں ہُوا۔

☆کوش کا بیٹا نمرود ،زمین پر ایک عظیم مگر جابر بادشاہ ،ایک غضبناک اور غالب آنے والا فاتح ،ایک عظیم شکاری اور یہواہ کے حضور سے سرکشی کرنے والا ،دلیر انسان تھا۔''

☆نمرود ہی ایک ایسی فوجی ریاست کے قیام کا بانی ہوا جو قبائلی طاقت پر مشتمل تھی۔

☆نمرود نے حضرت ابراہیم کو اللہ کی وحدانیت کا پرچار کرنے پر گرفتار کرا کے قبائلی جرگہ کے ذریعے انہیں آگ میں پھینکنے کی سزا سنائی۔

☆کوش کا یہ سرکش بیٹا فخریہ طور پر اپنے کو نمرود بیلوس کہلواتا تھا اور اس کے قبائلی فوجی چیتے کی کھال پہنتے تھے۔

---مندرجہ بالا تجزیہ سے نمرود بن کوش کا بلوچ ہونا پوری طرح

ثابت ہے۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ کوش کی نسل کہاں گئی۔ جناب انور قحطانی نے اپنے مضمون میں اعتراف کیا ہے کہ نمرود کوش خاندان سے تھا۔

--اگر انور صاحب نے ابوالقاسم منصور فردوسی کا شاہنامہ پڑھا ہے اور عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں، جیسے ادریسی، اصطخری، یاقوتی وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے تو یقیناً ان پر آشکار ہوا جو گا کہ 600ق م سے لے کر دسویں صدی عیسوی تک کوش خاندان، کوش قبیلہ کی شکل میں ایران کے کوہ البرز سے لے کر مکران کے صحرا اور ساحل تک پھیلا ہوا تھا جس پر سکندر رومی ، کیخسر و، انوشیروان اور بعد کے عرب حملہ آور یلغار کرتے رہے۔لیکن انہیں نیست و نابود نہ کر سکے اور نہ کہ اپنے علاقے سے انہیں بے دخل کر سکے۔نمرود بلوص کا یہ تاریخی خاندان ایران و مکران میں ''کوچ'' مشہور ہوا۔جبکہ عرب انہیں کوش، کفش یا کفج اور قفص بھی لکھتے رہے ہیں۔

......کلدانی خاندان کے اس معزز قبیلہ کا مرکزی مقام وادی ''کیچ'' ہے جو ہزاروں سالوں سے اسی نام سے آج بھی موجود ہے جو انور قحطانی کا بھی ضلع ہے۔''کوچ'' کا قدیم نام مقامی لہجے میں ''کیچ'' بنتا ہے تمام بلوچی بولنے والوں کو معلوم ہے کہ مشرقی و مغربی بلوچی میں سینکڑوں مقامات پر ''و'' ''ی'' سے بدل جاتی ہے جیسے۔

سور سے سیر، نور سے نیر، بوت سے بیت، بوتہ سے بیتہ، دھوت سے دھیت، ہارونک سے ہارینک، سوت سے سیت، دور سے دیر وغیرہ وغیرہ!!

اس طرح کوچ قبیلہ کا نام مقامی لہجے کی وجہ سے ''کیچ'' پڑ گیا۔ ان کا قلعہ ''کوش قلات'' کا نام ابھی تک اسی نام سے تُربت میں زندہ ہے۔ کیچ یا کوچ قبیلہ پر آخری بار عربوں نے 31 ھجری میں حضرت مجاشعہ کی سرکردگی میں حملہ کیا اور کیچ قلعہ کو منہدم کر دیا۔ دوسری طرف سے آخری حملہ محمود غزنوی کی فوجوں نے ان پر کیا اور انہیں منتشر کر دیا۔ عربی تاریخوں اور شاہنامہ فردوسی میں انہیں کوچ و بلوچ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جسے بعض مصنفین نے دو قبیلے ''کوچ اور بلوچ'' ترجمہ کیا ہے۔ جو کہ غلط ہے۔ ان کو یہ غلط فہمی ''و'' کو ''اور'' کے معنی پہنانے سے ہوئی ہے جیسا کہ فارسی میں اس کے معنی بنتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اس کا استعمال فارسی میں نہیں بلوچی میں ہوا ہے بلوچ، کوچوں کے لئے بلوچی ترکیب ''کوچ و بلوچ'' استعمال کرتے رہے ہیں۔ بلوچی میں ''و'' فارسی کے زیر کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو ''کا'' کے معنی دیتا ہے۔ کوچ و بلوچ کے بلوچی میں معنی بلوچ (قوم) کا کوچ (طائفہ) کے بنتے ہیں نہ کہ کوچ اور بلوچ کے، جیسا کہ مصنفین نے مطالب اخذ کئے ہیں۔ آج بھی بلوچی زبان میں ''و'' کا استعمال اسی طرح موجود ہے مثال کے طور پر ''خرز''، خواب خرگوش

،شاہ قلندر ،شاہ جہاں، چشم ظاہر ،صدق دل ،غم شادی وغیرہ الفاظ کے لئے بلوچی میں حرونز ،واب وکر گوشک ،شاہ وقلندر، شاہ وجہاں ، چم وظاہر، ستک ودل یادل وستک اور سکی وسوری بولا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کوچ وبلوچ کی ادائیگی بلوچی میں رہی ہے۔ جس سے مراد کوچ بلوچ ہیں نہ کہ کوچ اور بلوچ۔ ہمارے اس موقف کی تصدیق تاریخ سیستان (بہ تصحیح ملک الشعرا بہار) سے ہوتی ہے جس میں مذکورہ ہے کہ کوچ ایک گروہ تھا۔ جو کرمان ومکران وبلوچستان کی حدود میں سکونت رکھتا تھا۔ اور غالباً یہ بلوچ کے مترادف تھا۔ یہ طائفہ قدیم ایام سے راہزنی اور سرکشی میں شہرت رکھتا تھا۔ اور بڑے بڑے شاہان وقت اس سے نبرد آزما رہے ہیں۔ یہ طائفہ محمود غزنوی کی حکومت کے بعد رو بہ زوال ہوا۔ اور بتدریج کوچ کا نام درمیان سے غائب ہو گیا اور فقط بلوچ کا نام باقی رہ گیا''۔

عربی زبان کی تاریخی کتاب ''نزہتہ المشتاق'' میں کوش یا کوچ قبائل کے علاقے کی حدود اس طرح بیان کی گئی ہیں:-

''ان کے پہاڑ خلیج فارس تک پہنچتے ہیں ۔
شمال کی طرف نجر مان تک ،جنوب اور
مشرق کی طرف سمندر تک اور
مکران کے صحرا تک ،مغرب کی سمت

سمندر اور مُلک بلوچ ، ماتبان اور ہُرمُز تک ۔''

شریف ادریسی نے کوچوں کی بلوچی زبان کی طرف بھی اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:-

''قفص ، کرمان کی واحد قوم ہے
جو فارسی نہیں بولتی ۔''

یادر ہے کہ مکرانی بلوچی ، کیچ یا کوچ قبائل کی نسبت سے کیچی بھی کہلاتی رہی ہے۔

مندرجہ بالا مختصر جائزے سے ثابت ہوا کہ نمرود بلوچ کا قبیلہ کوش مکران ہی کا قبیلہ تھا۔ جس کا مرکزی مقام موجودہ کیچ کی وادی تھا، جو اسی قبیلہ کے نام پر موجود ہے ۔ مرکزی مقام کے علاوہ کوچوں کا قلعہ، کوش قلات کہلاتا تھا۔ یہ ''کوش کلات'' اپنے قدیم نام سے آج بھی کیچ کے ایک گاؤں کی صورت میں موجود ہے۔ اس طرح ہونا یہ چاہیئے تھا کہ نمرود بلوچ کے قبیلہ کا سراغ ملنے پر اسی سرزمین سے اس کی وابستگی کا بھی ثبوت ملتا، اور یہ ثبوت بھی موجود ہے۔

--مکران کا صحرا، عرب مصنفین کے ''المغازہ'' کا جنوبی حصہ دشت کا وسیع وعریض میدان ہے ۔ گوادری دشت کے اس میدان میں

سنٹ سر کا گاؤں ہے۔یہی قدیمی گاؤں نمرود بیلوص کا گاؤں تھا۔سنٹ سر تحصیل کے مغرب میں 4/5 کلومیٹر کے فاصلے پر مکران کا اہم ترین آثار قدیمہ دیوہیکل ٹیلوں کی شکل میں سر بفلک ایستادہ ہے جو کتابوں اور تعلیم یافتہ سرکل میں ''سنگیں ڈور'' کے نام سے مشہور ہے۔یہی نمرود کا قلعہ ہے۔ اور بلوچوں میں ''نمرودکلات'' کہلاتا ہے۔یہ قلعہ تاریخی ''ملک بلوچ'' کے مغربی حدود میں واقع ہے۔اغلب خیال یہی ہے کہ یہ خطہ نمرود بلوچ ہی کی وجہ سے ملک بلوچ کہلاتا تھا۔جس کا ذکر عربی تاریخوں میں ملتا ہے۔

نمرود کے معنی:-عربی لغت کے حوالہ سے کسی بھی جگہ نمرود کے معنی وہ نہیں بنتے جو جناب انور قحطانی نے لکھے ہیں۔عربی لغات ''بیان اللسان، المعجم اورالمنجد میں مختلف صورتوں میں ''نمرود'' کے معنی اس طرح ہیں۔

ا) نمر= پہاڑ پر چڑھنا(2) غضبناک ہونا۔(3) نمر= جوشیلا۔(4) نمر، نمتر،نمر،= چیتا۔(5) نمبرہ=

ا۔ایک دوسرے سے ملے ہوئے بادلوں کے ٹکرے

ب۔ایک سلاخ،جس پر گوشت کا ٹکڑا باندھ کر بھیڑیئے کا شکار کیا جاتا ہے۔دھاوی دار چادر۔

6= نمر ۔صاف شفاف پانی۔ بے داغ حسب۔

''نمرود'' کا مکمل لفظ کسی بھی عربی لغت میں موجود نہیں ہے۔نمر کا لفظ بلوچی میں بھی ہے جس کے معنی ''سخت جان'' کے ہیں۔اور بلوچی نام ''نمرود'' ہے جو صدیوں سے بلوچوں کے استعمال میں ہے۔اس کے معنی ''لافانی'' اور ''امر'' کے ہیں۔بلوچوں نے مختلف زمانوں میں یہ نام اپنایا ہے لیکن مذہبی لوگوں کے ڈر سے پھر اسے ''نوروز'' میں بدل دیتے رہے ہیں۔نوشیروانی ،رندوں ،زہریوں اور تالپوروں کے کئی سردار زادوں کے بچپن میں نام نمرود رکھے گے ہیں۔جنہیں پھر بلوغت میں نوروز کی شکل دیتے گئے ہیں۔تالپور امیروں نے اپنے ایک بحری جہاز (لانچ) کا نام نمرود نام کی محبت میں ''نمرود'' رکھا تھا۔جسکی ملاؤں نے مخالفت کی تھی لیکن اُنہوں نے جہاز کا نام بدلنے سے صاف انکار کیا۔میر نصیر خان تالپور نے ملاؤں کو کہا تھا کہ تسلی رکھیں۔

''یہ لانچ کفر نہیں پھیلائے گا۔''

نمرود قلات (قلعہ نمرود)

(بلوچستان کی تاریخ کا اہم ترین شہر پناہ)

مکران کا عظیم صحرا اور قدیم عرب جغرافیہ نویسوں کے ''المغازہ'' کا جنوب شرقی حصہ دشت کا وسیع و عریض میدان ہے جو دو اضلاع کیچ اور گوادر میں انتظامی طور پر تقسیم ہے۔ جہاں اکثر و بیشتر بگولے بدوش آندھیاں دھول اڑاتی رہتی ہیں۔ یہ بے پایاں کنار میدان خشک ندی نالوں اور جھنڈ کھنڈ کے جنگلوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں بارشیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کئی کئی سالوں تک بادلوں کا یہاں سے گذر بھی نہیں ہوتا۔ سمندر سے اٹھتی ہوئی گُبر اور اس کی نم آلود ہوائیں جھنڈ کھنڈ کے درختوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن جب کبھی گرجتے بادل اس دشت کا رُخ کرتے ہیں۔ تو تباہی لائے بغیر نہیں چھٹتے۔ تاریخ میں اس خطے نے سیلابوں کے نتیجے میں جتنی تباہیاں دیکھی ہیں شاید ہی بلوچستان کے کسی علاقے نے دیکھی ہوں۔ یہاں کی زرخیز مٹی کی سرزمین کے نیچے انسانی آبادکاری کی تین چار سطحیں دیکھنے میں آئی ہیں جو اس علاقے میں قدیم

ترین زمانوں سے انسانوں کی آبادکاری کو ظاہر کرتی ہیں۔دشت کی اس وسیع سرزمین کے نیچے سینکڑوں مکانات، قلعے، بھٹیاں، عبادت گاہیں اور بڑی بڑی قبرستانیں مدفون ہیں۔مکانوں کے ایسے سلسلے برآمد ہوئے ہیں کہ جن میں ان کے باسی انگھیٹی کے سامنے بیٹھے اور دیواروں سے ٹیک لگائی ہوئی حالت میں سیلاب کی زد میں آ کر مٹی میں دب کر رہ گئے ہیں ۔معلوم ہوتا ہے کہ ناگہانی سیلاب نے ان کو اچانک آن لیا ہے۔اور انہیں جان بچانے کا موقع نہیں ملا ہے۔

یہاں کے چپے چپے پر بڑی بڑی آبادیوں اور معدوم قلعوں کے آثار ملتے ہیں۔جن کی بربادی کے آثار اور ان کے قدیم نام معدوم نہیں ہوئے ہیں۔اور نظارہ کرنے والوں کو دعوت تحقیق دیتے ہیں۔گنجان انسانی آبادی کے یہ قدیم آثار کے قدیم نام ایسے قدیم قبائل کے اس خطے میں بودوباش رکھنے کی نشاندہی کرتے ہیں جن کو معدوم ہوئے سینکڑوں سال گذر چکے ہیں ۔یا پھر سینکڑوں سال قبل یہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان۔نیپال، تُرکی اور عراق کے اطراف میں آباد ہو گئے جہاں پر ان کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔

قدیم تُرک قبیلوں سے منسوب متعدد ٹیلے اور ڈھیریاں اس وسیع

میدان میں پھیلی ہوئی ہیں جو اس چیز کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ کسی زمانے میں کئی تُرک قبائل یہاں بود و باش رکھتے تھے۔ (واضح ہو کہ تُرکی اور بلوچی زبان میں سینکڑوں الفاظ مشترک ہیں۔ الفاظ کا یہ اشتراک سب سے زیادہ ناموں میں ہے) ان ٹیلوں میں سے کئی ''قلات'' (قلعے) کہلاتے ہیں۔ جن کا اب صرف ملبہ پڑا ہوا ہے۔ ایک بڑا اور کافی پھیلا ہوا ٹیلہ دیول کلات (دیول قلعہ) کے نام سے بھی موجود ہے۔ دیول یا دیبل ایک قدیم تُرک جنگجو قبیلہ تھا۔ جس نے غالباً حوادث زمانہ کے ہاتھوں یہاں سے ہجرت کر کے سندھ میں دیبل ''نامی شہر اور دیبل مندر آباد کیا۔ جو ساتویں صدی عیسوی تک موجود تھا اور سندھ اور ہند کی اہم ترین بندرگاہوں سے تھا۔ اسی دیبل آبادی پر محمد بن قاسم کی سرکردگی میں اسلامی لشکر نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ اور شاید اسی حملے کے نتیجے میں دشت کا یہ قدیم تُرک قبیلہ ہندوستان کی طرف ہجرت کر گیا۔ جہاں پر اس کے باقیات آج بھی موجود ہیں اور ہندو دھرم اختیار کئے ہوئے ہیں۔ دشت کے اس دیول کلات کے دمب سے مٹی کے کئی بُت اور سفید سنگ مرمر کا ایک بُت بھی خزانے کے متلاشیوں کو ملا ہے جسے انہوں نے تیس ہزار روپے میں افغان کفن کشوں کو بیچ دیا تھا۔

اسی دشت کے گاؤں کنری کے بالمقابل شمالی میدان جہاں ایک قدیم آبادی کے آثار کئی فرلانگ تک پھیلے ہوئے ہیں قدیم مکران کا ابتدائی سائٹ یا اصل مقام ہے جو اپنے وقت میں ایک بڑی مملکت کا مرکزی مقام رہا ہے۔ جسے حادثات زمانہ نے نشان عبرت بنا دیا ہے۔ سینکڑوں سالوں سے مملکت مکران کا نام تاریخ کی زینت بنتا چلا آ تا رہا ہے لیکن اس کی اصل جائے وقوع یعنی ابتدائی مرکزی مقام کا کسی کو علم نہیں تھا۔ جسے اس عظیم دشت نے اپنی پہنائیوں میں چھپایا ہوا ہے۔ یہ تاریخی مقام آج بھی اسی تاریخی نام کو سینے سے لگائے ہوئے مکران ہی کہلاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ خود دشت کا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ اپنے علاقے کی تاریخی اہمیت اور اس کے قدیم ناموں سے بے خبر انگور کی بیٹی کے عشق میں مدہوش و بے خود ہے۔

خطے کے وسیع سلسلے میں پھیلے ہوئے مدفون قبرستانوں میں ایسے کھڈے ملے ہیں جن میں متعدد لاشوں کے ڈھانچے اوپر نیچے پڑے ہوئے ہیں جنہیں شاید کسی لڑائی میں مار کر اور پھر اجتماعی قبر میں پھینک کر ان پر مٹی ڈال دی گئی ہے۔ ایک مقام پر خزانہ کے مثلاً شیوں کو ایک ایسی لاش ملی جس کے سر میں کلہاڑی پھنسی ہوئی تھی۔ جو یقیناً مارنے کے بعد نہ نکل سکی اور اُسے اسی حال میں دفن کیا گیا۔ یا شاید خود مارنے والوں نے مار کر اسی

حالت میں دفن کر دیا۔ پنودی کے قریب کھودی گئی ایک کنویں کے نوفٹ گہرائی میں مقبرے برآمد ہوئے۔

اس خطے سے برآمد شدہ راکھ بھرے مدفون جاروں اور مٹی کے منہ بند برتنوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر مردوں کو جلانے اور ان کی راکھ محفوظ رکھنے کا بھی رواج تھا۔

زیورات سے لدی پھندی عورتوں کی مدفون لاشیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ مرد اپنی عورتوں کو دی ہوئی زیورات کو انہی کی ملکیت میں رکھ کر کسی خاص عقیدے کے تحت ان کو دفن کرتے تھے یا شاید وہ ان کے زیورات اتارنا اپنی توہین اور کم ظرفی گردانتے تھے۔ الغرض دشت کا وسیع و عریض خطہ آثار قدیمہ کے نقطہ نظر سے کافی مالا مال ہے اور اپنے بھرپور سینے میں مدفون قدیم ترین تہذیبوں کے دریافت کرنے والوں کا منظر ہے۔

یہاں سے ہم اپنے موضوع پر بات کرنے کے لیے گوادری دشت کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں سُنٹ سر کا پھیلا ہوا بنجر میدان ہے جو سائیجی سلسلہ کوہ کے شمالی دامن میں پھیلا ہوا ہے۔ موجود وقت میں یہاں کی مختصر آبادی کیچی دشت سے آنے والے آبادکاروں پر مشتمل ہے جو یہاں کی قدیم روایتی تاریخ سے کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تاہم وہ سب کچھ جا

نتے ہیں جو انہوں نے یہاں کے قدیم باسیوں سے سن رکھا ہے۔ یہاں کے بوڑھوں کا کہنا ہیں کہ سنٹ سر کا موجودہ مقام کسی زمانے میں ایک بڑا ہور (خلیج یا کھاڑی) ہوتا تھا جو سمندر سے جُڑا ہوتا تھا۔ موجودہ نقشہ کو دیکھ کر اس بات کا یقین نہیں آتا لیکن چاروں سمت میں پھیلے ہوئے وسیع میدانی علاقے کا نام جو ابھی تک ''ہور'' ہی کہلاتا ہے اسے ایک قدیم خلیج ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ واضح ہو کہ موجودہ وقت میں گوادر کا سمندر اس مقام سے تقریباً پچاس میل پرلی طرف بہتا ہے۔

سلطنت ایران کے پرانے نقشوں اور عرب جغرافیہ نویسوں کی تصنیفات کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہی مقام ہے جو ہزاروں برس قبل ''شہر بلوص'' کے نام سے معروف تھا اور سلطنت کالدیہ کا ایک اہم تجارتی شہر تھا۔ جہاں پر تجارتی کشتیوں کی آمدورفت ہوتی تھی ۔ان تصنیفات کے مطالعہ سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مذکورہ مقام ملک فارس کے قدیم سرحدی ہمسایہ ملک ''مُلک بلوچ'' کا ایک اہم اور مشہور مرکز تھا۔ جہاں پر ایک تاریخی مندر ''مندر بیلوص'' بھی واقع تھا۔

ان قدیم مقامات اور ان کے ناموں کی صحیح نشاندہی زمانوں کی مناسبت سے موجودہ وقت میں ممکن نہیں ہے۔ قدیم آباد ''ملک بلوچ'' کے

اس جنوب مغربی غیر آباد دشت کے تحصیل سُنٹ سر کے مغرب میں چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر موجودہ مکران کا اہم ترین تاریخی شہر پناہ "نمرود کلات" (قلعہ نمرود) دیوہیکل ٹیلوں کی صورت میں زمین بوس ہے۔ "قلعہ نمرود" کا یہ تاریخی آثار قدیمہ پڑھے لکھے طبقے میں سوتکال ءِ قلات (جلی ہوئی جگہ کا قلعہ) اور یہ مقام "سُلگیں ڈور (جلا ہوا پہاڑی نالہ) کہلاتا ہے۔ حالانکہ "سلگیں ڈور" اس آثار قدیمہ کا تیسرا اور آخری مشرقی حصہ ہے۔ بلوچی میں ڈور ندی کے معاون نالے کو کہتے ہیں۔ سُنٹ سر کے مقام پر یہ تاریخی آثار قدیمہ دریائے دشت کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ جس کا موجودہ حدود اربعہ یوں ہے۔

مشرق کی سمت بُھنڈی جو (یعنی بُھنڈی نالہ۔ پرانے وقتوں میں سُلگیں ڈور کے جنوب میں ایک بڑا پائیں باغ ہوتا تھا جو دریائے دشت سے ایک نالہ کے ذریعہ سیراب ہوتا تھا۔ یہی نالہ بُھنڈی جو کہلاتا تھا) مغربی سمت میں دشت ندی، دیہی بل اور رگتی ڈھک نامی جگہیں ہیں۔ شمال کی طرف بھی دشت ندی ہے جو مغرب کو مُڑ جاتی ہے۔ جنوب کی طرف گوادر کا مشہور و معروف بلند و بالا سائجی سلسلہ کوہ ہے جو نمرود قلعہ کے لئے ایک بڑے حصار کا کام دیتا رہا ہے۔

دشت ندی کو پار کرتے ہی یہ آثار قدیمہ بائیں ہاتھ پر دیوہیکل ملبے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔اور لمبائی میں ایک مختصر سا پہاڑی سلسلہ لگتا ہے۔ اس کے تین حصے ہیں ۔پہلا اور سامنے کا حصہ ''نمرود کلات'' (نمرود قلعہ) کہلاتا ہے۔جس کی طویل فصیل کا ملبہ ایک دومنزلہ بلڈنگ کی اونچائی کے برابر ہے۔جس پر چڑھ کر پھر اس عبرت کدہ کے صحن میں اُترنا پڑتا ہے۔صحن کا رقبہ کم وبیش دو ہزار مربع گز بنتا ہے۔اور کئی سو مربع گز زمین چاروں طرف فصیل کے ملبے کے نیچے دبی ہوئی ہے۔قلعہ کی مشرقی فصیل تقریباً دومنزلہ مکان کی اونچائی کے برابر ہے جبکہ شمالی فصیل کی اونچائی تین منزلہ مکان کی اونچائی کے قریب قریب ہے۔شمال مغرب کی سمت فصیل کی چوڑی بنیادیں نظر آتی ہیں جو کہ تراشیدہ اور نیم تراشیدہ بڑے بڑے پتھروں سے اٹھائی گئی ہیں۔جس کی چوڑائی کسی بھی طرح سات/آٹھ فٹ سے کم نہیں ہوگی۔کہیں کہیں سوختہ اینٹیں بھی بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

قلعہ کی مغربی فصیل، مشرقی فصیل کی نسبت کم اونچی ہے جو پتھروں اور مٹی کا ایک لمبا اور چھوڑا پہاڑی بند دکھائی دیتا ہے۔جو ایک منزلہ مکان کی اونچائی کے قریب ہے۔لیکن نچلے پھیلے ہوئے ملبہ سے اندازہ ہوتا ہے۔کہ اس سمت کو بھی یہ دومنزلہ ہی رہا ہے۔

قلعہ کی فصیل پر پانچ بُرجیوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ چار بُرجیاں چاروں کونوں پر اور ایک بُرجی مشرقی فصیل کے بیچ میں رہی ہے۔ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی فصیل پر بنائی گئی بُرجی فصیل کی پرلی طرف کی رہائشی آبادی پر نظر رکھنے کے لیے بنائی گئی ہوگی۔ جو اس آثار قدیمہ کا دوسرا بڑا حصہ ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین اور خزانہ کے متلاشیوں نے سب سے زیادہ کھدائی اور مدفون اشیاء کی توڑ پھوڑ یہیں پر کی ہے۔

قلعہ کا مین گیٹ جنوب کی طرف سانجی سلسلہ کوہ کے فلک بوس حصار کے سامنے واقع رہا ہے۔جس کی چوڑائی دس سے بارہ فٹ کے اندازہ پر رہی ہے۔اب اس کے سامنے گیٹ کے باہر کی طرف کے دونوں کونوں کی بلند و بالا بُرجیوں کا ملبہ پڑا ہوا ہے۔ جو موجودہ وقت میں کسی تین منزلہ بلڈنگ کی اونچائی سے کسی طور کم نہیں ہے۔جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے وقت میں یہ بُرجیاں کم از کم چار منزلہ رہی ہوں گی۔اور ان کے سامنے شاید محافظین کے رہائشی مکانات ہوں گے جو اب ملبہ کی شکل میں بڑے پہاڑ لگتے ہیں۔جنہیں آثار قدیمہ والوں اور خزانے کی متلاشیوں نے جگہ جگہ کھودا ہوا بھی ہے۔

قلعہ کا صحن کافی کشادہ اور وسیع رہا ہے جہاں ہنگامی حالات میں

ایک بڑا لشکر جمع کیا جا سکتا تھا۔ صحن کے چاروں اطراف مستطیل فصیل کے دامن میں تعمیرات کے آثار نظر آتے ہیں۔ صحن میں جگہ جگہ کھدائیاں کی گئی ہیں۔ جہاں پر منقش اور سادے کچے برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے، منکے، پتھر کے اوزاروں کے ٹکڑے، پرندوں اور جانوروں کے شکار میں استعمال ہونے والے گول پتھر سینکڑوں کی تعداد میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قلعے کے صحن کی نسبت پرلی طرف کے رہائشی حصے میں یہ چیزیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ ویسے بھی رہائشی مقام کو سب سے زیادہ کھودا اور چھان مارا گیا ہے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ چند سال قبل تک یہاں غیر ملکی گورے آتے رہے ہیں۔ اور کئی کئی دنوں تک انہوں نے یہاں پر کیمپ کیا ہے۔ اور گاؤں سے مزدور لے کر کھدائیاں کرتے رہے ہیں۔ اور کئی اشیاء خفیہ طور پر ساتھ لے گئے ہیں۔

اس مقام پر ایک مدفون بھٹی اور ایک مندر کے آثار بھی ملے ہیں۔ جہاں سے سنگ مرمر کے کئی بُت بھی نکالے گئے ہیں۔ جنہیں آثار قدیمہ کے سمگلروں کو فروخت کئے گئے ہیں۔

اس قدیم ٹیلہ کا تیسرا اور آخری حصہ وہی مقام ہے جو ''ستھگلیں ڈور'' کہلاتا ہے۔ یعنی جلا ہوا یا خاکستر شدہ نالہ۔ اس مقام کو ایک دوسرے

نام ''سوتکال'' بمعنی جلی ہوئی جگہ بھی کہا جاتا ہے۔تقریباً تین سو مربع گز یا قدرے زیادہ رقبے پر مشتمل یہ ہموار جگہ معلوم تاریخ میں دو مرتبہ سیلابی مٹی میں دب کر پھر سیلابی ریلوں کے ذریعہ نمودار ہوا ہے۔مقامی لوگوں کے مطابق ایسا کئی بار ہوا ہے۔اب یہ جگہ ببول اور جھنڈ کھنڈ کے بلند و بالا درختوں میں گھری ہوئی ہے اور اس کا سارا رقبہ سیاہ اور جلا ہوا نظر آتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر مسلسل آگ جلائی جاتی رہی ہے۔سطح زمین سے کئی فٹ نیچے تک ایک ہی جلی ہوئی مٹی نکلتی ہے حتٰی کہ نیچے سے جو پتھر نکلے ہیں وہ بھی جلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔اس مقام سے کوئی تعمیراتی آثار نہیں ملے ہیں۔اس لئے یہاں پر کھدائی کا بڑا کام ہوا نہیں ہے۔

مقامی روایتوں کے مطابق یہی وہ تاریخی مقام ہے جہاں پر کالدیہ کے شہنشاہ نمرود بیلوص (بلوچ) کے حکم سے قبائلی جرگہ نے حضرت ابراھیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کی قبائلی سزا پر عمل درآمد کرنے کے لئے آگ جلانے کا اہتمام کیا تھا۔اور انہیں اسی آگ میں پھینک دیا گیا تھا۔

یہ مقام ایک فصیل کے اندر بنایا معلوم ہوتا ہے۔اس کے شمالی کنارے تک،نمرود قلعہ کے مشرقی کونے سے ایک لمبی فصیل کا ملبہ آن ملتا ہے اور جلے ہوئے سائیٹ یعنی سوتکال کے بالکل سامنے ایک مینار یا برج

کے آثار ہیں اور اس کا بلند و بالا ملبہ پڑا ہے۔ سنگیں ڈور کا یہ مقام نمرود بلوچ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کے مبینہ واقعہ کی صحیح تصویر دکھائی دیتا ہے۔ اس واقعہ کے بارے میں قرآن مجید کا بیان اور اسلامی روایتیں نقشہ کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں:-

''قوم کے لوگ کہنے لگے، ابراہیم کے لئے
ایک عمارت یعنی چار دیواری بناؤ پھر ابراہیمؑ
کو دہکتی آگ میں ڈال دو'' (پارہ ۲۳ رکوع۔)

جناب قاری اشرف احمد صاحب نے اپنی مشہور تصنیف ''تذکرۃ الانبیاء'' جلد اول ۱۴۹ پر معارف القرآن کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:-

''ایک مہینہ تک سارے شہر کے لوگ آپ کے جلانے کے لئے لکڑی وغیرہ سوختہ کا سامان جمع کرتے رہے۔ پھر اس میں آگ لگا کر سات دن تک اس کو دھونکتے رہے اور بھڑکاتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کے شعلے فضا آسمانی میں اتنے اونچے ہو گئے کہ اگر کوئی پرندہ اس پر گزرے تو جل جائے۔ اُس وقت ارادہ کیا کہ حضرت ابرہیم علیہ السلام کو اس میں ڈالا جائے۔ تو فکر ہوئی کہ کیسے ڈالیں؟۔ اس کے پاس تک جانا کسی کے بس میں نہیں تھا (کیوں کہ جو پرندہ اس کے پاس سے گزرتا اس کی تپش سے جل کر

کباب بن جاتا) شیطان نے ان کو منجیق (گوپیا) میں رکھ کر پھینکنے کی ترکیب بتائی"۔

آگے لکھتے ہیں کہ:۔

"نمرود کی بیٹی رعضہ تھی جو اوپر کھڑی ہوئی تھی۔ اور ابراہیم کے آگ میں ڈالے جانے کے تمام واقعہ کو تعجب سے دیکھ رہی تھی۔" صفحہ ۱۵۰۔

"سنگلیں ڈور" کا تاریخی مقام مندرجہ بالا واقعات کی زندہ تصویر ہے۔

بُرمز کا یہ قریبی خطہ، قدیم سلطنت کالدیا کا علاقہ رہا ہے۔ جو اللہ کی وحدانیت کے منکر نمرود بلوچ کا آبائی وطن تھا۔ جو طاقت اور قبائلی قوت کے غرور میں خود کو اپنے خود ساختہ دین کا خدا کہتا تھا۔ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وحدانیت کی تبلیغ کو اپنے حدود سلطنت میں مداخلت سے تعبیر کیا اور اُسے گرفتار کرا کر اپنی قوم کے علاقے میں بھیج دیا اور ان کا کیس سرداروں کے جرگہ کے حوالہ کیا۔ جہاں پر قبائلی سرداروں نے انہیں آگ میں ڈالنے کی سزا سنائی۔ یاد رہے کہ بلوچوں میں زمانہ قدیم سے آج تک ملزمان کی سچائی کو پرکھنے کی غرض سے انہیں یا تو آگ اور انگاروں سے گذارا جاتا یا گہرے پانیوں میں ڈبویا جاتا رہا ہے۔

قلعہ نمرود کے اس قدیم آثار کے شمال اور مغرب کی طرف دشت

کی بڑی ندی ہے۔علاقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ سینکڑوں سال پہلے اس مقام پر سمندر کا پانی ایک ہور (خلیج یا کھاڑی) کی شکل میں موجود جمع ہوتا تھا ۔اسی گذرگاہ سے اس مقام تک بڑی بڑی تجارتی کشتیاں آتی تھیں۔اور یہ مقام ایک اہم تجارتی منڈی ہوا کرتی تھی۔دریائے دشت کا یہ قرب وجوار کا علاقہ اب بھی ''ہور'' یعنی خلیج کہلاتا ہے۔اس وسیع تپتے دشت کے اس میدان میں اب بھی جگہ جگہ سمندری حیات کے فاسلز کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔جو مقامی بلوچوں کے سینکڑوں سال پرانی روایتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

اب اس تاریخی مقام کے بارے میں آثار قدیمہ کے ماہرین کی رپورٹوں کی طرف آتے ہیں جن کا خلاصہ ہم نے بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی شائع کردہ کتاب ''بلوچستان ماقبل تاریخ'' سے اخذ کیا ہے۔جو معروف محقق ملک محمد سعید بلوچ کی تصنیف ہے۔وہ لکھتے ہیں:۔

1955ء میں Pea Body Musium ہارورڈ یونیورسٹی کی طرف سے آثار قدیمہ کے ماہرین کی ایک ٹیم نے ڈاکٹر ہنری فیلڈ کی سرکردگی میں بلوچستان ہجری دوَر کی باقیات کی تفتیش کے سلسلہ میں کئی علاقوں کے دورے کئے۔جن میں کیچ اور وسطی مکران کے کئی علاقے شامل تھے۔

اس ٹیم نے اپنے دوروں کے دوران پینتیس کے قریب ٹیلوں اور ڈھیریوں پر باقیاتی تفتیش کا کام کیا۔ جن میں مکران کا یہ اہم ترین شہر پناہ "سنگلیں ڈور" کا سائٹ بھی شامل تھا۔ 1959-60ء کے دوران نیچرل ہسٹری میوزیم نیویارک کی ایک اورامریکی ٹیم نے بھی لس بیلہ اور مکران کے ساحلی علاقوں میں باقیاتی تفتیش کا کام کیا۔ اور حجری دور کے استعمال کردہ حجری اوزار اور ظروف گلی دریافت کئے۔ اس ٹیم نے بھی سنگلیں ڈور کے دو چار مقامات پر کھدائی کا کام کیا اور کافی باقیات اکٹھی کیں۔ اس ٹیم نے سنگلیں ڈور کے مقامات سے حاصل کردہ ظروف گلی، چقماقی پتھر اور پتھر کے چھوٹے اور درمیانی درجے کے گولوں کا جائزہ لیا۔ اور اس کلچر کو عراقی کلچر کا نمائندہ قرار دیا۔

اس جماعت کے فاضل اراکین نے اپنا سفر کوہ ملان سے شروع کیا۔ اور اسے جیونی بندر تک جاری رکھا۔ انہوں نے اس علاقہ میں بڑی محنت اور جان فشانی سے باقیاتی تفتیش کی۔ اپنی ابتدائی سرگرمیوں میں انہوں نے سب سے پہلے سنگلیں ڈور کے قدیم ٹیلے کا جائزہ لیا۔ جو دریائے دشت کے کنارے واقع ہے یہاں سے اہم شواہد دریافت کر لئے۔ انہوں نے سنگلیں ڈور کے قلعہ کے عین وسط میں ایک خندق کھدوائی جس کے

دوران تعمیرات کی تین صورتیں دریافت ہوئیں اور یہ تینوں صورتیں اہل فصیل کے ساتھ تعمیری رشتہ رکھتی تھیں۔

اسی کتاب میں آگے ''ساحلی بستیاں'' کے موضوع پر ''سلگیں ڈور'' کے بارے میں آثار قدیمہ کی رپورٹوں کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

''یہ قدیم بستی دریائے دشت کے کنارے واقع ہے۔اس کے معنی جلے ہوئے ٹیلے کے ہیں (فاضل مصنف نے ڈور کے معنی ٹیلہ کے لکھے ہیں جو کہ غلط ہے۔ڈور کے معنی اس مضمون کے شروع میں لکھ دیئے گئے ہیں) یہاں ماہرین آثار قدیمہ کی نگرانی میں کئی ایک خندقیں کھودی گئیں۔جہاں آٹھ نوفٹ کی گہرائی تک ٹھیکریاں ہی ٹھیکریاں پائی گئیں۔اور سب سے اہم دریافت یہ ہوئی کہ یہاں ایک ٹھوس فصیل کے آثار دریافت ہوئے۔اس فصیل کا احاطہ مستطیل ہے۔اندر کی طرف سے اس کی لمبائی شمالاً جنوباً 170 گز ہے اور شرقاً غرباً اس کی چوڑائی 125 گز ہے۔یہ شہر پناہ پتھر کی چوکور سلوں سے تعمیر کی گئی تھی۔جن کو مٹی کے گارے سے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔اس کے جنوب مغربی گوشے میں ایک دروازہ کے آثار پائی گئے جو تقریباً 8 فٹ چوڑا ہے۔اس دروازہ کے دونوں طرف مستطیل بُرج بھی تعمیر کئے گئے تھے۔کھدائیوں کے دوران یہاں ایک

خاکدان بھی ملا جس کے اندر راکھ بھری ہوئی تھی ۔خیال ہے کہ انسانی لاشوں کو جلانے کے بعد ان کی ہڈیاں راکھ سمیت اسی خاکدان میں دفن کی جاتی تھیں۔اس جگہ سے خاکستر سے بھرے ہوئے برتن بھی ملے ہیں۔

اس قلعہ کے عین وسط میں ایک خندق کھدوائی گئی۔ جہاں عمارات کی تین صورتیں دریافت ہوئیں۔ جو ہڑپہ کلچر کے لوگوں سے تعلق رکھتی تھیں ۔ابتدائی تعمیرات کی خصوصیت پتھر کے بنے ہوئے عمارتی ڈھانچوں سے ظاہر ہوتی ہے۔تعمیرات کی دوسری صورت میں وہ فرش ہے جس کی بنیاد میں پتھر استعمال کیا گیا تھا اور تیسری صورت وہ باقاعدہ عمارتی آثار اور ڈھانچے ہیں جن کی دیواروں کو نیم تراشیدہ پتھر کی سلوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔اس خندق کی کھدائی کے دوران وہ چٹان بھی 12 فٹ کی گہرائی میں دریافت ہوئی جس کے اوپر قلعہ تعمیر کیا گیا تھا اور اس سے فصیل کا اندرونی رُخ بھی ظاہر ہوا جس کے سامنے ساڑھے سات فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا اونچا چبوترہ تعمیر کیا گیا تھا۔ان کی تعمیرات کا زمانہ وہی ہے جس کے دوران خود فصیل کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ یہاں ایک مسلسل آبادی کے آثار دریافت ہوئے جو کلیتاً ہڑپہ کلچر پر مشتمل تھی ۔اس بستی کے باشندوں کا سب سے اہم پیشہ تجارت تھا۔ یہ لوگ ماہی گیری کے فن میں پوری طرح ماہر تھے اور کشتی بانی

اور کشتی سازی میں بھی مہارت رکھتے تھے اور سمندر تک ان کو رسائی حاصل تھی ۔خیال ہے کہ وادی سندھ ،عراق اور خلیج فارس کے درمیان جو مال بردار کشتیاں چلتی تھیں وہ خوراک اور پانی حاصل کرنے کے لئے یہاں لنگر انداز ہوتی تھی ۔ یہاں سے خشک مچھلی دساور کو بھیجی جاتی تھی ۔اس قسم کے ظروف گلی کے نمونے دریافت کئے گئے ہیں جو کلیتاً ہڑپہ کلچر سے تعلق رکھتے ہیں یہاں سے تانبا اور پتھر کے اوزار اور اسلحہ بھی دریافت کئے گئے ہیں یہاں سے سیپ گھونگھے اور مچھلی کی ہڈیوں کے زیورات اور منکے بھی ملے ہیں

آثار قدیمہ کے ممتاز ماہرین جن میں آر ۔آئی ۔رائیکس اور مسٹر ہارگریوس بھی شامل ہیں نے بلوچستان میں پتھروں سے تعمیر کردہ شہر پناہ اور فصیلوں میں سب سے اہم ترین شہر پناہ اور فصیل سنگلیں ڈور کے اس قلعہ کو قرار دیا ہے"

حیرت کی بات ہے کہ ان ماہرین نے صرف باقیاتی تفتیش تک اپنا کام محدود رکھا اور اس اہم ترین مقام کی روایتی تاریخ کا کھوج نہیں لگایا انہوں نے وسیع وعریض قلعہ کے علاوہ سوختہ اور سیاہ شدہ ڈور کے بارے میں روایتوں کا کھوج نہیں لگایا اور نہ کہ اس مقام کی کُھدائی کی ۔ یہ یقینی امر تھا کہ اگر یہ ماہرین روایتی تاریخ کا کھوج لگاتے تو اس مقام کے اہم شہر پناہ

اور قلعہ کا تاریخی نام انہیں چونکا دیتا اور وہ مختلف زاویوں اور تاریخی حوالوں کی روشنی میں نہ صرف اپنے تفتیشی کام میں مزید دلچسپی لے کر اس کو وسعت دیتے بلکہ مزید جہتوں پر بھی تحقیق کرتے جس کے نتیجے میں تاریخ کے کئی پہلو منکشف ہو سکتے تھے۔

نمرود قلعہ کے اس تاریخی یادگار کو آثار قدیمہ کے غیر ملکی ماہرین نے پورے بلوچستان کا سب سے اہم ترین شہر پناہ قرار دیا ہے لیکن وائے افسوس کہ آثار قدیمہ کے پاکستانی ادارے نے اسے شاید بلوچ تاریخ سے نسبت رکھنے کی بنا پر نظر انداز کیا ہے حالانکہ اس ادارے یا محکمہ نے کئی معمولی اور غیر اہم ٹیلوں پر نظر کرم کی ہوئی ہے جن کو بلوچوں کی تاریخ وتہذیب سے نسبت نہیں ہے۔

ظلم پر مزید ظلم یہ روا رکھا جا رہا ہے کہ گوادر کو جانے والی مجوزہ ریلوے ٹریک کے نشانات اسی تاریخی مقام کی شمالی دیوار اور اس کی بُرجیوں کے ملبے کے اوپر لگائے گئے ہیں جس سے بلوچستان کا یہ اہم ترین آثار قدیمہ صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا جو تقریباً ساڑھے چار ہزار سال سے موجود ہے۔ بلوچ لیڈروں خصوصاً بلوچ دانشوروں اور بلوچ تہذیب وثقافت سے محبت رکھنے والوں کے لئے متعلقہ سرکاری سروے

کاروں کا یہ منفی اقدام جس کی بروقت نشاندہی کی جارہی ہے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم سیاسی سماجی اور ادبی تنظیموں کو اس طرف متوجہ کرتے ہوئے وفاقی حکومت کے متعلقہ ادارے سے گذارش کرتے ہیں کہ ریلوے کے مجوزہ ٹریک کے نشانات کو نمرود قلات کے ملبہ پر سے ہٹا کر شمالی میدان سے یعنی ہور کے درمیان سے گزارا جائے تا کہ یہ تاریخی آثار قدیمہ کم از کم اپنی موجودہ حالت میں تو باقی رہے۔

کراچی کی تاریخ

بلوچ پس منظر میں

کراچی کا بنیادی نام ''کلانچی'' تھا جسے ہندو بیوپاریوں کے سندھی لہجہ نے ''کراچی'' کی صورت دی ہے۔ سندھی بولنے والے کئی مقامات پر ''ل'' کو ''ر'' میں بدل دیتے ہیں جیسے کہ بلوچ کو سندھی ''بروچ''، بلوچی کو ''بروچکی'' اور تلوار کو ''ترار'' بولتے ہیں اسی طرح کلانچی ان کی ادائیگی میں ''کرانچی'' اور پھر کراچی میں بدل گیا ہے۔

کلانچی یا کلاچی بلوچوں کا ایک قدیم تاریخی قبیلہ ہے اس قبیلہ کے لوگ نسلاً ہوت بلوچ ہیں جو مکران کے موجودہ ضلع گوادر کے ایک گاؤں ''کلانچ'' سے ہجرت کر کے سمندر کے ساتھ ساتھ بستے گئے اور اپنے قدیم مسکن کی نسبت سے کلاچی مشہور ہوئے۔ باور کیا جاتا ہے کہ گوادر پر سولہویں صدی عیسوی میں پرتگیزی قزاقوں کے پے در پے حملوں اور لوٹ مار کے نتیجے میں کلاچیوں کی سندھ کی سمت ہجرتیں وقوع پذیر ہوئیں۔

معروف محقق عارف حسن اپنے مقالوں The Death of Indul اور Delta A changing City scape میں لکھتے ہیں کہ کلانچی ایک

بلوچ قبیلہ کا نام ہے جس نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں کاچی اور تھر پارکر سندھ میں ''ٹنڈو کلاچی'' آباد کئے۔ اس قبیلے کے بزرگوں کا دعویٰ ہے کہ کسی وقت کراچی کھاڑی ان کے آباواجداد سے آباد تھی۔

تاریخی کتابوں اور مسودات سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ 1710ء تک کراچی میں نو آبادکاری نہیں ہوئی تھی اور پورا علاقہ تھوہر کے کانٹے دار درختوں کا جنگل ہوتا تھا۔ البتہ دور دور سندھی مال چرانے والوں کی جھونپڑیوں کے جھنڈ اور ہندوؤں کے اکا دکا مندر ہوتے تھے۔ ان مندروں میں اہم ترین مندر مہادیو کا غار مندر ہوتا تھا۔ جوشیو کا مندر مشہور تھا۔ جہاں پر ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے زائرین آتے تھے جہاں پر سمندر کے دیوتا کو نذر چڑھائی جاتی تھی۔ یہ کلفٹن کی پہاڑی کے نیچے واقع ہے اس کا ذکر ''رامائن'' میں بھی آنے کا بیان کیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ سندھ کا ایک رسوائے زمانہ حکمران راجہ دلوزائے نے اپنا سرمائی پایہ تخت اسی مندر کے قرب وجوار میں قائم کیا تھا۔ اور وہ چاندرات سے چاند کی دس تاریخ تک اسی مندر کے غار میں پوجا کرتا تھا اس دوران وہ ایک لمحے کے لئے بھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ عارف حسن نے اپنے مضمون ''کراچی، تغیرات کی زد میں'' میں لکھا ہے کہ قیاس کیا جاتا ہے کہ پندرھویں

صدی عیسوی کے حکمران راجہ دلورائے کا پایہ تخت اس جگہ رہا ہوگا جواب باتھ آئی لینڈ کہلاتا ہے وہ مزید لکھتا ہے کہ ''کراچی کے ایک انیسویں صدی کے باشندے نے درج کیا ہے کہ اس نواح میں 1859ء تک کسی شہر کے کافی آثار موجود تھے'' اس حکمران کا مرکزی دارالحکومت ''اروڑ'' بتایا گیا ہے اس کی حکمرانی کے روایتی آثار بلوچستان کے ضلع خضدار اور خاران کے تحصیل بیسیمہ تک بیان کئے جاتے ہیں بیسمہ میں ایک قدیم ٹیلہ بھی دلو رائے سے منسوب ہے اس کے متعلق مشہور ہے کہ ہر دلہن سے پہلی سہاگ رات منا تا تھا ۔اور اسی گناہ سے باز نہ آنے کی پاداش میں اُس کا دارالحکومت مع اس کے خاندان کے زمین میں دھنس گیا تھا۔کلفٹن کا غار مندر ہندو روایتوں کے مطابق اس مقام پر دو ہزار سالوں سے موجود ہے۔ یہ مقام ساتویں صدی عیسوی کے ملک دیبل کی ابتدائی سرحد ہوتی تھی اور یہ مندر دیبل کا سب سے بڑا مندر شمار ہوتا تھا اور اسی مندر پر ملک کا سب سے بڑا جھنڈا لہراتا تھا اپنے وقت میں یہ مندر غار مندر کے نام سے موسوم نہیں تھا بلکہ راجہ داہر کا مندر کہلاتا تھا غالبا یہی وہ مندر تھا جس پر محمد بن قاسم کی سرکردگی میں اسلامی لشکر نے منجیقوں سے حملہ کر کے لہراتا ہو جھنڈا گرایا تھا ۔مقامی ہندوؤں کا کہنا تھا کہ ابتدا میں یہ مندر تین منزلہ تھا لیکن اسلامی لشکر

کے حملہ میں زمین بوس ہوا اور پھر صدیوں تک گھنے جنگل میں رو پوش رہا۔مہادیو کے اس قدیم مندر کا قدیم ہمسایہ عبداللہ شاہ غازی کا مزار ہے جو چند سو گز کے فاصلے پر موجود ہے۔شاہ صاحب کا انتقال غاروں کے اسی سلسے کے آخری سرے پر 763ء میں ہوا جہاں ایک غار میں وہ عبادت کیا کرتے تھے اور وفات پانے پر وہیں دفن کئے گئے۔وہ اسلامی لشکر کے غاز یوں میں سے تھے۔اس بلند مرتبت بزرگ کا دوسرا بھائی یوسف شاہ تھا جن کی زیارت منوڑا جزیرے میں ہے ان کے متعلق انگریز مصنفین نے لکھا ہے کہ کوئی بھی جہاز اُس وقت تک بندرگاہ میں داخل یا بندرگاہ سے روانہ نہیں ہوسکتا تھا جب تک وہ منوڑا پیر کی درگاہ پر نذرانہ نہیں دیتا تھا۔واضح ہو کہ مذکورہ نذرانوں سے منوڑا آنے جانے والوں کے لئے لنگر تھا جہاں پر مسافروں کو دونوں وقت فی سبیل اللہ کھانا ملتا تھا۔

مہادیو کے اس غار مندر اور شاہ عبداللہ غازی کے مزار کے علاوہ اس وسیع و عریض جنگل میں دو مقام ایسے تھے جو کراچی بننے سے قبل موجود تھے۔ایک مقام ''دربو'' تھا جو غار مندر سے شمال کی طرف تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔جہاں مچھیروں کی چند جونپڑیاں تھیں۔بلوچ میدوں کی روایتوں کے مطابق ان مچھیروں کا تعلق ''کورک''(korak) قبیلہ سے ہوتا

تھا۔ یہ قبیلہ اب بھی معمولی تعداد میں اور ماڑہ، پسنی اور پنجگور ضلع کے ''کاٹاگری'' میں آباد ہے۔ پنجگور میں یہ لوگ ضلع گوادر کے مقام ''کاٹاگر'' سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ اس قدیم ساحلی قبیلہ کا شمار بحری قزاقوں میں ہوتا تھا۔ راجہ داہر کی حکمرانی کے زمانہ میں یہ قبیلہ آئے دن بحری جہازوں کو لوٹتا تھا۔ راجہ نے انؐ کے خلاف کئی مُہمیں سر کیں لیکن وہ انہیں زیر نہیں کر سکا تھا۔ ان کی لوٹ مار کا تدارک محمد بن قاسم کے اسلامی لشکر سے ممکن ہو سکا اور غالبًا اسی زمانے میں اس قبیلہ کے لوگ سمندر کے ساتھ ساتھ ساحل بلوچستان پر منتقل ہو گئے یا پھر ممکن ہے کہ وہاں پر پہلے سے موجود ہوں۔ خود کورنگوں کا کہنا ہے کہ ان کے آباواجداد اور ماڑہ کے قدیم ترین آتش پرست مید باشندے تھے جو تجارتی جہازوں میں مال لیکر سری لنکا اور مالا بار تک مال پہنچاتے تھے اور موقعہ ملنے پر قزاقی بھی کرتے تھے ان کے کہنے کے مطابق سری لنکا میں ان کے رشتہ دار اب بھی ہیں۔ معروف محقق عارف حسن کے کہنے کے برعکس کراچی کی آبادکاری سے قبل کے تاریخی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ قرب وجوار میں کئی چھوٹی چھوٹی دیہی آبادیاں یا بستیاں موجود تھیں جن میں، منگھ پیر، ملیر، گڈاپ، اورنگی، لیاری، گابوپٹ، سونگل، آملانو، شمس، موئیدان، کونکر، بابا بھٹ اور رہیڑی

بندر'' (جو قدیم زمانے میں مشہور لاہیری بندر کہلاتا تھا) شامل ہیں عبدالحمید شیخ نے اپنے مقالہ Information Sector housing society of Gots in Karachi'' میں لکھا ہے کہ چوکنڈی اور گڈاپ کے قریب بلوچوں کی پرانی قبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ کراچی شہر کے اردگرد کے علاقے میں بہت عرصہ پہلے بھی دیہی بستیاں موجود تھیں'' وہ مزید لکھتے ہیں کہ ان بستیوں کی آبادی زیادہ تر برنت (بُرفت) کلمتی، خاصخیلی اور جھوکیہ قبائل پر مشتمل ہوتی تھی۔'' کچھ قبیلے ان سے بھی قدیم تر علاقے میں موجود تھے جن کا تذکرہ شیخ نے نہیں کیا ہے جن میں نُہمردی، جت اور دابلو قبیلے شامل ہیں۔ واضح ہو کہ بلفت اور جھوکیہ قدیم بلوچ قبیلہ نہمردی کی شاخیں ہیں جو پندرھویں اور سولہویں صدی عیسوی میں خضدار کے درہ مولہ کی پہاڑیوں میں بود وباش رکھتی تھیں۔ جن کا ذکر ابو الفضل نے اپنی مشہور تصنیف آئین اکبری میں بھی کیا ہے۔

دوسرا مقام ''دربو'' سے تقریباً نو دس میل پرے شمال میں پیر کمال الدین کی درگاہ تھا۔ جو منگھ پیر کے نام سے مشہور ہے اس مقام پر ایک قدیم مندر ''لالا جسراج مندر'' ہوتا تھا۔

پیر کمال الدین کی زیارت کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ تیرھویں صدی

سے قائم ہے یہ جگہ منگہ پیر اس لئے کہلاتا ہے کہ منگہ نامی ایک کلمتی بلوچ جو پیر کمال الدین کی درگاہ کا ایک عقید تمند اور مجذوب خلیفہ تھا جسے بعد از مرگ اسی درگاہ میں دفنا دیا گیا تھا۔ جو پھر اسی بلوچ بزرگ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ عارف حسن کے مطابق یہ مقام ڈھائی ہزار سال سے آباد تھا۔ مندرجہ بالا چھوٹی چھوٹی جگہوں کے علاوہ کوئی دوسرا قابل ذکر مقام موجود نہیں تھا۔ ہاں البتہ ''دربو'' ہی کے ساتھ کلاچی بلوچوں کی کچھ جھونپڑیاں پانی کے ایک جوہڑ کے کنارے آباد تھیں یہ جوہڑ سندھی میں ''کلاچی جوکن'' کے نام سے مشہور تھا۔ لیاری کے بلوچوں کے مطابق کلاچی بلوچ اس مقام کو ''ٹوبہ کلاچی'' کہتے تھے اور یہ مقام ''دربوکھنڈ'' بھی کہلاتا تھا۔

یہی وہ مقام تھا جہاں پر کراچی کی مرکزیت بنی۔ عبدالحمید شیخ لکھتے ہیں کہ کراچی ایک زمانے میں ماہی گیروں کی چھوٹی سی بستی تھی۔ جو کلاچی جو گوٹھ کہلاتا تھا۔ اور ماہی گیری کے ایک مقام کے قریب واقع تھا۔ جسے گوٹھ کی نسبت سے ''کلاچی جوکن'' کہا جاتا تھا وہ مزید لکھتے ہیں کہ ماہی گیری کے اس مقام کے بارے میں راجا دلورائے کے زمانے کی ایک کہانی بھی مشہور ہے جس میں مورڑو نامی ایک شخص کے ماہی گیر بھائیوں کو مگر مچھ نے نگل لیا تھا اور اس نے اپنی ذہانت اور کاریگری سے کام لے کر اس مگر مچھ کو مار ڈالا

تھا۔ مورڑو کے بھائیوں کی لاشیں مگر مچھ کے پیٹ سے نکال کر کیماڑی کے قریب دفن کی گئی تھیں یہ قبریں اب بھی ماری پور کے پُل کے قریب، لوکل ٹرین کے وزیر مینشن اسٹیشن کے سامنے کی طرف موجود ہیں۔ مورڑو کے وارث اب تک کراچی کے مختلف گوٹھوں شمس، بابا بھٹ، رہیڑی میاں اور ابراھیم حیدری میں رہتے ہیں''

اس مقام کی آبادکاری، جو کراچی کی ابتدائی تاریخ ہے، کا بیان برطانیہ حکومت کے ایک نامور ہندو ایجنٹ سیٹھ ناؤمل ہوت چند کی یادداشتوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔ سیٹھ ناؤمل انگریزوں کی مدد کرنے اور سندھ میں ان کی بالادستی قائم کرانے والا سب سے بڑا ایجنٹ تھا جسے بعضوں نے سندھ کا غدار کہا۔ لیکن اُس کے اس کردار کے بارے میں معروف مصنف پیر علی محمد راشدی نے لکھا ہے کہ ''اگر ناؤمل نے غداری نہ کی ہوتی تو سندھی مسلمان اب تک گھوڑوں اور اونٹوں پر اور سندھی ہندو گدھوں اور خچروں پر سفر کر رہے ہوتے''۔

سیٹھ ناؤمل ہوت چند 12-1811ء کے دوران سامتانی کے مرکزی مقام ''کاہری'' میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ شہر نار دریا کے مغرب میں بھان شہر کے قریب واقع تھا۔ اس کا باپ ہوت چند ایک بڑا کاروباری شخص تھا۔ جس

کے کارندے شاہ بندر، ٹھٹھ، چانڈکا، شکار پور، بیلا، سون میانی وغیرہ میں ہو
تے تھے، اور بحر ہند کے ساحلی علاقوں کے تقریباً پانچ سو شہروں میں اس کی
تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ جن میں لاکھوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ قحط کے دنوں میں
ہوت چند سینکڑوں گوداموں میں جمع شدہ غلہ، باجرہ، جوار، چاول وغیرہ تما
م قحط زدہ انسانوں میں بغیر کسی مذہبی، قومی، لسانی تخصیص کے بانٹتا تھا۔ یہ
سخاوت اکثر وہ رات کو دیئے گل کر کے کرتا تھا تا کہ کوئی کسی کو نہ پہچان سکے
کہ دینے والا کون ہے اور لینے والا کون ہے۔

سیٹھ ناؤمل اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ ان کے ایک بزرگ سیٹھ سجن مل
نامی ہوتے تھے۔ جن کی کاہری میں بڑی زمینداری ہوتی تھی۔ اور وہ ایک
کاروباری شخص اور صرّاف بھی تھے۔ سجن مل کا ایک کاروباری بیٹا بھوجومل تھا
جو سولہ سال کی عمر میں اپنی سوتیلی ماں سے ان بن کی وجہ سے کاہری چھوڑ کر
سیوھن گئے اور وہاں سے ایک قافلہ بنا کر کسی دوسرے شہر میں کاروبار کی
تلاش میں نکلے۔ ان دنوں کراچی نامی کسی شہر کا وجود نہیں تھا البتہ حب ندی
کے دہانے پر ایک تجارتی بندرگاہ ''کھڑک'' تھا یہاں کی تجارت مشہور تھی۔
جہاں سے مشرق اور مغرب کے متعدد ممالک کو درآمد و برآمد کیجاتی تھی''
کھڑک بندرگاہ کے بارے میں عارف حسن تحریر کرتے ہیں کہ موجودہ

کراچی کے مغرب کی سمت کھڑک بندر، بحیرہ عرب پر ایک اہم بندرگاہ تھی۔ اس کا قطعی محل وقوع متنازعہ ہے مگر اہم شہادتیں اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ دریائے حب کے دہانے راس ماری پر واقع تھا''

عارف حسن کا یہ کہنا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے جو نام انہوں نے لکھا ہے وہ ''راس ماری''، نہیں راس مواری ہے اور آجکل ''موالی'' کہلاتا ہے۔ میں نے خود اس کے قدیم ٹیلہ اور عظیم الشان قبرستان کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہاں کی قبریں دو دو تین منزلہ کی قبریں ہیں جن پر سمندری چٹانوں سے تراشیدہ چوکو راور مستطیل منقش سلیں رکھ دی گئی ہیں۔ یہ قبریں حب میں بھوانی اور چو کنڈی قبرستان کے قبروں جیسی ہیں۔ مقامی لوگوں نے انہیں کلمتی بلوچوں کی قبریں بتائیں۔ کئی قبروں پر مدفون کا نام اور قبیلہ بھی لکھا ہوتا تھا۔ جو صاف طور پر نہیں پڑھی جاسکتیں۔ ایک دو قبروں پر لفظ جاموت بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ سمندری چٹانوں کی سلوں پر کی گئی کاریگ.ی اور نقش کاری اور اس طرز تعمیر کو رومی کہا جاتا ہے۔ رومی کلمتی بلوچوں میں لکڑیوں اور پتھروں پر کند ہ کاری کرنے والوں کی ایک ذات کا نام تھا۔ جو کندہ کاری کے کام کا ماہر ذات تھی۔ 1987ء میں شاہ نورانی کی وادی میں میں نے اسی طرز تعمیر کے ایک قبر کی منقش سل کے کونے پر یہ لکھا دیکھا ''نکش کار'' سرمان رومی کلمتی

''(سرمان، سلمان کی بلوچی ادائیگی ہے)

موالی کا یہ چھوٹا سا خوبصورت قبرستان اور دیگر بکھری ہوئی قبریں اس بات کی برملا اظہار ہیں کہ یہ مقام کسی وقت بڑی مصروف بندرگاہ رہی ہے۔ یہاں کے ٹیلوں سے مقامی لوگوں کو سونے، چاندی، نگینے اور کئی نادر اشیا ملتی رہتی ہیں۔ سیٹھ ناؤمل ہوت چند کے کہنے کے مطابق 1729ء میں سیٹھ بھوجامل کاروبار کرنیکی غرض سے یہاں آ کر بس گیا۔ اور اپنے کارندے گوادر، بیلا مستط اور اس سے آگے شیراز، بوشہر اور بحرین میں روانہ کئے۔ جنہون نے وہاں تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ کچھ عرصہ بعد کھڑک بندر کا دہانہ سمندر کی جانب ریت سے بھر گیا اور جہازوں کو لنگر انداز ہونے میں مشکل پیش آئی۔ اور پھر جہاز لنگر انداز ہونا بند ہو گئے اور یہ تجارتی بندرگاہ ایک مختصر عرصہ میں ویران ہو گیا۔ تب بھوجامل نے اپنے کارندے قرب وجوار میں ایک نئی جگہ تلاش کرنے کے لئے روانہ کئے تاکہ یہاں سے چلا جائے اور ایسی جگہ آباد ہو جائے جہاں تجارت اچھی ہو۔

تلاش کرتے کرتے کارندوں کی نظر کراچی کے ساحلی علاقے پر پڑی۔ ایک جگہ ریت کے ایک بند کے پیچھے ملاحوں کی ایک چھوٹی بستی اُنہیں نظر آئی یہ جگہ ''دربو'' تھا جس کے قریب پانی کا ایک چشمہ تھا۔ یہ چشمہ ''کلاچی کن

''کہلاتا تھا۔ناؤمل لکھتے ہیں کہ کن'' کے معنی ایک گہرے پانی والا گڑھا اور کلاچی ایک میر بحر کا نام تھا۔گڑھے کے ارد گرد کھجور کے پیڑ تھے۔بھوجامل نے یہ جگہ پسند کیا۔اور مکان بنانے لگے اور پھر کھڑک بندر سے اپنا سارا مال اور سامان یہیں منتقل کیا اور سب کلاچی گاؤں میں آ کر بسنے لگے۔اور پھر یہی جگہ کراچی مشہور ہو گیا۔

سیٹھ ناؤمل لکھتے ہیں کہ اُس وقت منوڑے کی کھاڑی نہیں بنی تھی۔بابا جزیرے (بابا بھٹ) کے اوپر ایک اور کھاڑی تھی جو آمدورفت کے لئے استعمال ہوتی تھی۔1729ء کے لگ بھگ کھڑک بندر کے دیگر لوگ بھی آ کر کراچی میں آباد ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ کلاچی بلوچوں کی اس چھوٹی بستی کی سرکردہ شخص ایک بلوچ عورت تھی۔جس کا نام بی بی مراداں کلاچی تھا۔یہ لائق اور جہاندیدہ عورت کلاچی قبیلہ کی سربراہ تھی۔عموماً مائی کلاچی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔اسی بی بی مراداں کلاچی کے مشورے سے بھوجامل نے بستی کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ کی تعمیر کی حامی بھری۔جسے اس نے اپنے تجارتی مال واسباب کے تحفظ کے لئے ضروری سمجھا۔اس مقصد کے لیے بستی کے آس پاس کھجوروں کے پیڑوں اور جنگل کو صاف کرا کے قلعہ تعمیر کی گئی۔ناؤمل لکھتا ہے کہ قلعہ کی

تعمیر کرنے والے مزدوروں کو مسقط کے سکے اور کھجور مزدوری میں دی جاتی تھی ۔ یہ قلعہ بھی 1729ء کے دوران تعمیر ہوا۔ جب کام مکمل ہوا تو بھو جامل نے اپنے جہازوں میں مسقط سے توپیں منگوائیں اور قلعہ کی دیواروں پر نصب کرائیں ۔قلعہ کی اندرونی زمین تقریباً ساٹھ ستر جریب اراضی تھی۔انگریزی ریکارڈ میں 135 ایکڑ لکھا ہوا ہے۔ قلعے کے دو دروازے تھے۔ایک مغرب کی جانب اور دوسرا شمال مشرقی جانب تھا۔کلاچی بلوچ انہیں سوراپی دپ اور وشابی دپ کہتے تھے۔جبکہ ہندو مغربی دروازے کو کھا رادرواز واور شمالی دروازہ کو ''مٹھو دروازو'' کہتے تھے جو پھر کھارادر'' اور میٹھا در بنے۔

عارف حسن اس قلعہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''برطانوی ماخذات میں اس فصیل بندی کا جو 135 ایکڑ رقبہ پر محیط تھی تفصیلی بیان موجود ہے۔ فصیل کے ہر رخ پر برج تھے تاکہ گردونواح پر مکمل نگاہ رکھی جاسکے اور ہر گوشے پر مدور مینار تھے جن پر توپیں نصب تھیں۔ فصیل بندی سولہ فٹ اونچے مٹی کے پشتے پر کی گئی تھی اور ان پر بنے ہوئے مورچے مزید دس فٹ اونچے تھے ۔شہر کے دو دروازے تھے سمندر کے رُخ پر واقع دروازہ ''کھارادر'' اور دوسرا دریائے لیاری کی خشک سطح کے میٹھے پانی کے کنوؤں کی

طرف والا ''میٹھادر'' کہلاتا تھا۔ ٹالپر انتظامیہ کے فارسی وقائع میں ان کا ذکر ''شوردروازہ'' اور ''شیریں دروازہ'' کے نام سے آتا ہے۔ 1839ء میں کراچی پر قبضہ کرنے والے سندھ ریزروفورس کے کیپٹن ویلینٹ کا بیان ہے کہ دروازے اور بالائی برج جن پر بلوچ پہرہ دار مقرر تھے ایک پرشکوہ منظر پیش کرتے تھے''۔

وہ قلعہ کے قطعی مقام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کراچی کی فصیلوں اور دروازوں کے قطعی مقام کا تعین آسان ہے۔ دیواروں کو انگریزوں نے 1849ء میں مسمار کرادیا تھا۔ اور ان کی جگہ جنوب اور مغرب میں رمپاٹ روڈ، جنوب میں ریور روڈ (حالیہ آغا خان روڈ) اور مشرق میں حاجی عبداللہ سڑیٹ نامی سڑکیں بنادی تھیں۔ ان سڑکوں سے گھرا ہوا 135 ایکڑ کا رقبہ ابھی تک ''اولڈ ٹاؤن کوارٹرز'' کے نام سے جانا جاتا ہے اور گردنواح سے دس سے پندرہ فٹ بلند ہے''۔

''کھارادر کا قطعی محل وقوع اس مقام اتصال پر تھا جہاں اب مچھی میانی روڈ جو اس زمانے میں ''راہ بندر'' کہلاتا تھا، کے دروازے سے شروع ہوکر بندر گاہ پر اس جگہ ختم ہوتا تھا جو اب نیٹیو جیٹی (Native jetty) ہے۔ میٹھادر شہر کی شمال مشرقی حد پر ریور روڈ اور گاؤ گلی کے مقام اتصال پر تھا۔ دریائے

لیاری جو شہر کی شمالی دیوار کے ساتھ بہتا تھا اس کا رخ برطانوی قبضے کے بعد نہر (channel) نکال کر اور زیادہ شمال کو موڑ دیا گیا کیوں کہ اس سیلاب سے شہر کو سخت خطرہ رہا کرتا تھا۔"

"برطانوی قبضے کے وقت فصیل کی حالت بہت خستہ تھی تاہم یہ فصیل 1772ء اور 1773ء میں دو طویل محاصروں کا مقابلہ کر چکی تھی۔ آخر میں 1774ء کے تیسرے محاصرے میں پرانے شہر نے طویل مذکرات کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اس کی کنجیاں ٹالپر بلوچ افواج کمانڈر فقیرو کے حوالے کی گئیں۔ اس طرح کراچی، قلات کی عملدارن سے نکل کر سندھ کے ٹالپر میروں کے قبضے میں آ گیا۔"

شہر کی تمام آبادی قلعہ کے اندر رہائش پذیر تھی ارد گرد کھجور کے پیڑ اور تھوہر کے درختوں کا جنگل تھا۔ کچھ عرصہ بعد شاہ بندر کا دہانہ بھی ریت سے بھر گیا اور وہاں کے رہائشی بھی کراچی آ کر بسنے لگے۔ جب کلاچی کی چھوٹی بستی ایک گاؤں بن رہا تھا تو سندھ کے کلہوڑوں نے خاموشی سے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضہ کے لئے ٹھٹھہ کے کلہوڑے حاکم نے ملیر کے جھو کیہ قبیلہ کے سردار بجار جھوکیہ کو استعمال کیا جسے پھر انہوں نے جام کا خطاب دیا۔

ناؤمل لکھتا ہے کہ کلہوڑوں اور خان قلات کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں خان کا جاڑک خان نامی بھائی مارا گیا جس کے خون بہا میں کلہوڑوں نے کراچی خان قلات کے سپرد کیا۔ جہاں پر قلات کی افواج کا ایک دستہ تعینات کیا گیا اور ملا شفیع علی خان کو کراچی کا نواب مقرر کیا گیا جو ایک کٹر مسلمان تھا۔ اس کے دور میں ہندو مندر دریا تھان پر حملہ ہوا۔ ہندوؤں نے خان سے اس بارے میں شکایت کی۔ خان نے ملا شفیع علی خان کو برخاست کر کے حاجی سعد و نامی شخص کو نواب مقرر کیا اور ہندو آبادی کو مطمئن کر دیا۔ 1783ء میں ٹالپر بلوچوں نے سردار میر بجار خان کی سرکردگی میں کلہوڑوں سے اقتدار چھین لیا۔ لیکن کراچی ان کے قبضے میں نہ آسکا 1791-92ء کے دوران میر فتح علی ٹالپر نے کراچی پر قبضے کے لئے پندرہ ہزار بلوچوں پر مشتمل توپوں اور گولوں سے مسلح لشکر روانہ کیا۔ اس لشکر کی سرکردگی میاں فقیرو اور پلیا نامی کمانڈر کر رہے تھے۔ ٹالپر فوج نے قلعہ کے بیرونی جنگل میں لیاری کی طرف قلعہ کو تین اطراف سے محاصرے میں لیا ہوا تھا۔ آبادی قلعہ کے اندر تھی۔ اس محاصرے اور شہر کے دفاع کے بارے میں ناؤمل لکھتے ہیں کہ قلعہ پر توپیں نصب کی گئیں۔ ادھر دیواروں کی حفاظت، رعیت کی جانب سے پانچ میر بحروں اور میرے بزرگوں کے

جہازوں کے خلاصیوں نے ہمارے بزرگ سیٹھ بلرام داس کی نگرانی میں کی۔شہر کے دفاع کے لئے جو گولہ بارود سیٹھ کیول رام نے استعمال کیا تھا وہ ہمارے گوداموں سے منگایا گیا تھا۔ جہاں ہمیشہ ہمارے تجارتی جہازوں کے لئے جنگی اسباب موجود رہتا تھا۔حملہ آور فوج نے ڈھائی ماہ تک قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا تھا۔لوگ سارے قلعے کے اندر تھے جہاں ضرورت کا کافی سامان موجود تھا۔سمندر کی طرف کا راستہ کھلا ہونے کی وجہ سے خوراک کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔تاہم کھانا پکانے اور پینے کے لئے پانی کی تنگی تھی جو اُس وقت لوگ لیاری ندی سے لاتے تھے۔مجبوراً انہیں قلعہ کے اندرونی کنویں کا کھارا پانی استعمال کرنا پڑا۔ڈھائی ماہ کے بعد ٹالپروں کی فوج تھک ہار کر حیدرآباد لوٹ گئی۔

1792ء میں میر فتح علی خان ٹالپر نے دوسری مرتبہ فوج بھیج کر لیاری ندی کے کنارے سے قلعہ پر گولہ باری کی اور تین ماہ تک قلعے کا محاصرہ کیا لیکن اسے فتح نہیں کر سکا۔ناؤمل کہتا ہے کہ اس مرتبہ سیٹھ بلرام داس نے قلعہ میں رعیت اور اپنے کارندوں کی مدد سے قلعے کی حفاظت کی اور اپنے جہازوں کی حفاظت کے لئے رکھے گئے اسلحہ و بارود کو قلعہ کی حفاظت کے لئے خرچ کیا۔

تیسری بار میر فتح علی خان نے پھر بیس ہزار کا بلوچی لشکر روانہ کیا۔ یہ سال 1794ء کا تھا۔ اس وقت کراچی کا کرتا دھرتا سیٹھ دریا نومل تھا جس کے خان قلات اور ٹالپر میروں سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ انہوں نے خان قلات کو پیغام بھجوایا کہ سندھ کے ٹالپر بلوچ تیسری مرتبہ ہم پر لشکر چڑھا رہے ہیں۔ آپ کا یک معمولی دستہ یہاں پر متعین ہے جو ٹالپروں کے پندرہ بیس ہزار فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور ہمارا شہر آئے روز خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ ہمارے گوداموں کا اسلحہ بارود ختم ہو چکا ہے اب ہم میں مقابلے کی سکت نہیں ہے۔ اس لئے آپ مزید فوج بھیج کر شہر کے دفاع کی تدبیر کریں۔ جس کے جواب میں خان نے لکھا کہ مجھ میں لڑائی کی طاقت نہیں ہے اگر تم دفاع کرسکو تو کرو ورنہ تم پر کوئی الزام نہیں۔ اس بیچ میں خان کا نواب حاجی سعد واپنے دستے کے ساتھ لڑائی لڑنے کی تیاریوں میں تھا کہ خان کا جواب اُسے پہنچا دیا گیا۔ تب اُس نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور دریا نومل نے اپنے لوگوں کی حفاظت میں اُسے قلات روانہ کیا۔

خان قلات کا جواب ملتے ہی سندھ سے میر کرم علی ٹالپر کا قاصد بھی دریا نومل کے نام خط لے کر آیا تھا۔ میر نے لکھا تھا کہ آپ سے ہماری دوستی پرانی ہے اور ہمسائیگی بھی ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خان قلات کراچی کے دفاع

کی پوزیشن میں نہیں ہے ہمیں یہ سن کر دکھ ہوا کہ آپ نے ہمارے خلاف مدافعت کی اور ہماری فوجوں کے خلاف اپنا اسلحہ بارود استعمال کیا۔ ہم دوست، ہمسایہ اور ہم وطن ہیں ۔آپ ہمارا ساتھ دیں اور دوستی کو مضبوط کریں۔

سیٹھ دریانومل نے براہمانی بلوچ قبیلہ کے ایک معزز فرد فقیرا کو جو اُس کی ملازمت میں بھی تھا، خط دے کر روانہ کیا جس میں اُس نے میر کرم علی ٹالپر کو لکھا تھا کہ میں کراچی آپ کے حوالہ کرنے کو تیار ہوں ۔لیکن میری گذارش ہے کہ جب کراچی آپ کے حوالہ کیا جائے تو بلوچ سپاہیوں کو جو ایک سرکش اور بے لگام طبقہ ہے شہر میں داخل ہونے نہ دیا جائے ۔دوسری بات یہ ہے کہ جن نواب کا آپ تقرر فرمائیں گے اُسے ہمارے مشورے کا پابند بنانا ہوگا۔اور ہماری رعیت پر ظلم نہیں ہوگا۔ میر کرم علی نے شرائط ماننے کا وعدہ کیا ۔اور فقیرا بلوچ کو میر فتح علی ٹالپر کے پاس روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ گولہ باری بند کریں اور دریانومل سے مشورہ کریں کیوں کہ ہمارے درمیان صلح ہوگئی ہے۔ صلح کے بعد دوسرے روز میر فتح علی خان کی ہدایت پر فقیرو اور پلیا نے بلوچی فوج کے سپہ سالاروں کی حیثیت سے اپنے سینکڑوں معززین کے ساتھ دریانومل کا استقبال کیا۔ جہاں پر سیٹھ نے دونوں سپہ سالاروں کو قلعے

کے دونوں دروازوں کی چابیاں تھمادیں۔ سپہ سالاروں نے سیٹھ کو یقین دلا یا کہ ہر کام ان کے مشورے سے ہوگا اور کوئی بلوچ یا غیر بلوچ قلعہ میں اُس کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوگا۔ اس مقصد کے لئے ایک سو کلمتی بلوچ کراچی کی حفاظت پر مامور کئے گئے۔

سیٹھ ناؤمل نے اس واقعہ کی ہندی تاریخ سنبت 1851 (بمطابق 1794-95) کے بڑے مہینے کی گیارہ تاریخ لکھی ہے جبکہ عارف حسن نے اپنے مقالات میں یہ سال 1774ء کا بتایا ہے۔

ٹالپر میروں کو کراچی کی تسخیر سے بہت خوشی تھی۔ انہوں نے سیٹھ دریانومل کو اعزازی طور پر کراچی کی آمدنی سے حصہ دینے کی پیشکش کی لیکن سیٹھ نے یہ حصہ اس بنا پر لینے سے انکار کیا کہ مبادا خان قلات یہ سمجھے کہ سیٹھ نے کسی لالچ میں کراچی میروں کے حوالہ کیا ہے۔ سیٹھ نے صرف وہ رعایت قبول کی جو کلہوڑوں کے دور حکمرانی اور خان قلات کی عملداری کے ایام میں اُسے حاصل تھی۔ یعنی ذاتی استعمال کے لئے شراب بنانے کی اجازت۔ لیکن میر فتح علی خان نے اُس کے باغات پر لگان کی معافی اور آبکاری محصولات کا تہائی حصہ ان کو سوغات کیا۔ سیٹھ دریانومل کا انتقال 1820ء میں ہوا۔

کراچی پر بالادستی قائم کرتے ہی ٹالپر میروں کو بندرگاہ میں داخلے کے راستے کی اہمیت اور نزاکت کا احساس ہوا۔اس لئے انہوں نے منوڑا جزیرہ پر بندرگاہ کے عین سامنے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔جس کے بارے میں عارف حسن تحریر کرتے ہیں کہ ''قلعہ کے ساتھ بندرگاہ کے داخلے کی سمت ایک مدور دیدبان (watcch tower) تعمیر کیا گیا۔دونوں عمارتیں پتھروں سے بنی تھیں۔قلعہ ایک مربع نما عمارت تھی جس کے مرکز میں ایک چوگوشہ میدان تھا۔اس کے کونوں پر برج بنائے گئے تھے۔اور اسے ایک نیم مدور چھوٹے احاطہ بند مورچے سے مزید مضبوط بنایا گیا تھا۔اس کے گرداونچی دیواروں میں بندوقچیوں کے لئے روزن بنے ہوئے تھے۔انگریزوں کی فتح کے وقت پچیس جھوکیے اور دس بلوچ قلعہ کی حفاظت پر معمور تھے ان سب کو مجموعاً 120 روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

1804ء میں میر کرم علی ٹالپر کراچی کا والی مقرر ہوا تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان کے احمد آباد پر قبضہ کرلیا اور سندھ میں ان کی آمدورفت تجارتی سلسلے میں تھی۔کئی مقامات پر انگریزوں کی پارٹیاں تجارتی سرگرمیوں کے بہانے گھس جاتی تھیں۔جس سے میر کرم علی ٹالپر اور دیگر ٹالپر والیوں کو تکلیف ہوتی تھی۔جو قدرتی بات تھی۔وہ یہ برداشت نہیں کرتے تھے۔کہ

انگریز اپنی مرضی سے ان کے علاقے میں بغیر ان کی اجازت کے آجا یا کریں۔انگیریز میروں کے اس رویے کو جان چکے تھے۔

1835-36ء کے اواخر میں الیگز ینڈر برنس کا بھائی ڈاکٹر جیمز برنس کراچی کا چکر لگانے آرہا تھا۔ان دنوں الیگز ینڈر برنس کی تعنیاتی لاہور میں ہوچکی تھی۔اس نے اسکی اطلاع حیدرآباد میں میروں کو کردی۔ جہاں پر میر نور محمد، میر نصیر خان ٹالپر، میر محمد خان ٹالپر اور میر صوبدار خان ٹالپر کی مشترکہ حکومت تھی۔انہوں نے کراچی میں اپنے نواب حسن خان کو لکھا کہ ڈاکٹر جیمز کو کراچی اترنے کی اجازت نہ دی جائے۔ڈاکٹر مذکور کو کراچی پہنچنے ہی حسن خان نے واپس حیدرآباد میں کرنل پاٹنجر کے پاس پہنچا دیا۔ پاٹنجر نے ایک انگریز کی اس بے عزتی کو بری طرح محسوس کیا لیکن چپ رہا۔ 1837ء میں پاٹنجر نے حیدرآباد کے میروں کو اطلاع کرائی کہ بارہ آدمیوں پر مشتمل سروے پارٹی کیپٹن کاریس کی سرکردگی میں کراچی بندرگاہ کا دہانہ ناپنے کی غرض سے آرہا ہے یہ ان کا تجارتی مشن ہے اس لئے ان کے کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔میروں نے اپنی رضامندی ظاہر کی تھی اور حسن خان کو لکھا کہ ان کا انتظار کرے اور ان کو کام کرنے دے۔لیکن جب پارٹی اپنا کام کرنے کے بعد سیر اور شکار کرنے کی غرض سے منوڑا گیا تو حسن

خان نے ان کے پیچھے مسلح آدمی بھیج کر انہیں بھگا دیا۔ جب انگریزوں نے حیدر آباد میں میروں سے اس واقعہ کی شکایت کی۔ میر غصے میں آ کر حسن خان کو برخاست کرنے والے تھے کہ حسن خان نے ہندو سیٹھوں کے توسط سے کیپٹن کاریس سے معافی مانگی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کاریس تین ماہ تک کراچی میں مقیم رہے اور تجارتی جہازوں پر اپنا کام کرتے رہے اور پھر سون میانی سے جہاز پکڑ کر بصرہ چلے گئے۔

1838ء میں انگریزوں کی ایک فوج سر جان کین کی قیادت میں بمبئی سے کابل جانے کے لئے شکار پور کو چھاؤنی بنانے کی غرض سے جانے والی تھی۔ جس کے لئے انہیں دو ہزار اونٹ سامان کی باربرداری کے لئے کرایہ پر درکار تھے اس سلسلے میں ہندو کارندے اونٹوں کی خریداری کے سلسلے میں کراچی سے ٹھٹھہ تک پھیل گئے تھے۔ جب میروں کو پتہ چلا کہ ہندو بنئے انگریز کے لئے اونٹ خرید رہے ہیں تو انہوں نے جگہ جگہ ان کے کام میں رکاوٹ ڈلوایا۔ اور لوگوں کو خبردار کیا کہ انگریز کے لئے اونٹ نہ بیچیں کیوں کہ وہ انگریز کو سندھ سے گزرنے نہیں دیں گے۔ انگریز کو میروں کی یہ حرکتیں سخت ناگوار گزر رہی تھیں جن کی مخبری بقول سیٹھ ناؤمل کے وہ خود کر

رہے تھے ۔جواب کرنل پاٹنجر کے دوست بن چکے تھے ۔ انگریزوں کی مذکورہ فوج گھارو سے آگے بامنی کوٹ میں قیام پذیر تھی اور حیدرآباد جانے کی تیاری میں تھی جہاں گدّو بندر کے مقام پر انگریزوں کی رسد کے مال واسباب کے بیشمار گودام تھے ۔ابھی انگریزی فوج وہاں پہنچ نہیں پائی تھی کہ میر پور خاص کے میر شاہ محمد ٹالپر نے ایک لشکر کے ساتھ گدو بندر کے گودام لوٹ لئے اور شہر میں آگ لگادی ۔انگریزوں کو جب خبر پہنچی تو فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا گیا کہ ٹھٹھہ اور جھرک کے درمیان چھاؤنی کرے ۔جھرک میں چند دن بعد کچھ سپاہیوں نے دو یورپی شکاریوں کو قتل کردیا ۔ان تمام حالات نے ٹالپروں کے خلاف انگریزی منصوبہ بندیوں کو مہمیز دیا ۔کرنل یا ٹنجر نے ان اقدامات کا ذمہ دار حیدرآباد کے ٹالپروں کو قرار دیا اور انہیں قاصدوں کے ذریعے تنبیہ کی ۔اس تنبیہ نے ٹالپروں کو ڈرادیا اور انہوں نے آغا اسماعیل شاہ کو نمائندہ بنا کر پاٹنجر کے پاس بھیجا اور گدو بندر کے گوداموں کے لوٹنے کا اعتراف کیا اور ہونے والے نقصانات کا معاوضہ دینے کی پیشکش کی ۔جو منظور کر لی گئی ۔اور ٹالپروں کی طرف سے آغا اسماعیل شاہ نے ستائیس لاکھ روپے کی رقم انگریزوں کو مشہدی سکوں کی

صورت میں ادا کر دیا۔اس کے بعد انگریزی فوج شکار پور کے لئے روانہ ہو گئی ۔لیکن اسی دوران ایڈمرل فریڈرک میٹلینڈ کو کراچی پر قبضہ کرنے کا حکم جاری کیا گیا۔جس کی میروں کو خبر نہ ہوئی تھی ۔اگلے تین چار دنوں میں انگریزی فوج پوری تیاریوں کے ساتھ کراچی بندرگاہ پہنچی۔ یہ 3 فروری 1839ء کا دن تھا کہ برطانوی آفیسر ایچ ایم ایس ولزلی نے پوری شدت سے منوڑا قلعہ پر گولہ باری شروع کی جو تین گھنٹے تک جاری رہی۔اس گولہ باری سے قلعے کی مغربی دیوار گر گئی ۔اور پورا کراچی دھویں میں چھپ گیا ۔ٹالپروں کے مقامی عمال نواب خیر محمد نظامانی اور اللہ رکھیہ نے انگریزی افسروں سے گولہ باری بند کرنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ ہم مقابلہ کی سکت نہیں رکھتے اس لئے حملے بند کئے جائیں۔اور پھر حملے روک دیئے گئے ۔اس ضمن میں عارف حسن لکھتے ہیں کہ ''7 فروری 1839ء کو منوڑا قلعہ کے صوبدار حاصل بن بچا خان نے اپنے عسکری آفیسر کی جانب سے اور سینا خان نے ٹالپر حکومت کی شہری انتظامیہ کی طرف سے شہر کو فریڈرک لیوس میٹلینڈ (ایسٹ انڈینز میں ہر برٹینک میجسٹی کی بحری افواج کے کمانڈر انچیف) کی تحویل میں دینے کے معاہدے پر دستخط کئے ۔ہتھیار

ڈالنے کی دستاویز کی شرائط کے تحت انگریزوں کو منوڑا پر قبضہ اور کراچی شہر میں فوج رکھنے کا حق حاصل ہو گیا تاہم شہر کی انتظامیہ کی عنان ٹالپر امیروں کے ہاتھ میں رکھنے دی گئی۔

اگلے روز انگریزوں اور میروں کے نمائندوں نے معاہدے کے مطابق انگریزی فوج کے لئے چھاؤنی لگانے کی جگہ تلاش کی اور شہر اور رام باغ کے درمیان جگہ پسند کی گئی۔ اور دوسرے دن چھاؤنی لگ گئی جس کا سپہ سالار کرنل سپلر کو مقرر کیا گیا۔ اور کیپٹن بانڈ کو ان کا معاون بنایا گیا جسے دو دن بعد ہی منگھو پیر کے جنگل میں بلوچوں نے قتل کر دیا۔ جس کی لاش وہاں کی جھاڑیوں سے برآمد ہوئی۔

انگریز کو جھوکیوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ کیپٹن بانڈ کو شاہ نورانی کے کلمتی خلیفہ چاکر نے چھٹہ اور باریجہ قبیلہ کے لوگوں کی معاونت سے مار دیا ہے۔ اس قتل کی رپورٹ کرنل پاٹنجر کو دی گئی۔ اس نے میروں کو کہلا بھیجا کہ خلیفہ چاکر کو اس کے ہمراہیوں کے ساتھ کراچی چھاؤنی میں ہمارے حوالے کرائے۔ چنانچہ خلیفہ کو شاہ بلاول کے مقام سے گرفتار کرا کر انگریزی فوج کے حوالے کیا گیا۔ یہ گرفتاری چھٹہ قبیلہ کے سردار صاحب خان کے ذریعہ عمل میں آئی تھی جسے انگریزوں نے کئی دیگر خدمات کے عوض خلعتیں اور

انعامات سے نوازتھا۔خلیفہ چاکر پر مقدمہ چلا اس پر ثابت کیا گیا اور کیپٹن بانڈ کوقتل کرنے کے مقام پر خلیفہ چاکر کو پھانسی دی گئی۔

کراچی کے حالات موافق نہیں تھے۔انگریز شہر میں کاروباری گھما گھی چاہتے تھے اور اسی تگ دور میں لگے رہتے تھے۔لیکن ٹالپر میر لوگوں کو ہراساں کررہے تھے۔اورانہیں دکان لگانے سے منع کررہے تھے اوراس سلسلے میں میر صوبدار خان نے سخت خفیہ احکامات دیے تھے۔اور کاروباری ان احکامات کونظر انداز نہیں کرسکتے تھے۔انہی ایام میں صوبدار خان کے بلوچ لشکر نے حیدر آباد میں انگریزی سفارت خانے پر حملہ کیا اوراسے تباہ کیا اوراپنے قاصدوں کوملیر میں نُہمردی قبیلہ کے سردار جام مہر علی جھوکیہ ،ملک احمد خان نہمردی اور کلمتی ملک ،میر ابراہیم کلمتی کے پاس روانہ کیا اور لکھ بھیجا کہ وہاں اپنے متحدہ لشکر کے ساتھ کراچی کی انگریزی چھاؤنی پر یلغار کرکے اسے جلادیں اور قتل وغارت گری کریں۔اوراگر کسی مقامی شخص کوانگریز کا ساتھ دیتے پائیں تواسے بھی قتل کردیں۔دوسری طرف میروں نے اپنے کراچی کے نائبین اور عمالوں کوبھی لکھا کہ ان آدمیوں اور ان کے لشکروں کی بھرپور امداد کریں۔تاکہ یہ مہم کامیاب ہوسکے۔مذکورہ

سرداروں نے لشکر مجتمع کئے اور بھر پور حملے کی تیاری کرلی اور شہر کے مسلمانوں کو خفیہ اطلاع کرائی کہ جونہی آس پاس ہماری یلغار کی اطلاع پہنچے تو تم لوگ فوراً اپنے اہل وعیال کے ساتھ کراچی سے نکل جاؤ۔لیکن یہ خبر خفیہ نہ رہ سکی اور بات انگریزوں تک پہنچ گئی تھی۔اور انہوں نے فوری طور پر کاروائی کرنے کا حکم جاری کیا تھا۔سندھ ریزرو فورس نے 16 فروری 1843ء کو پورے شہر کو گھیرے میں لے لیا تھا۔خوف کے مارے بیشتر آبادی نے بندرگاہ پر کھڑی جہازوں میں پناہ لی ہوئی تھی اور اکثر کراچی سے باہر بھاگنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

بازاریں اور دکانیں ویران تھیں۔چھاؤنی میں فوجی نہ ہونے کے برابر تھے۔تمام کراچی ان کے کنٹرول میں تھا۔پریڈی اپنے اسلحہ برداروں کے ساتھ گشت پر تھا۔پہلے ان کا دستہ فلیگ اسٹاف کے پاس گیا۔اور ٹالپروں کے آفیسروں اور اہل کاروں کو نیچے اتارا اور توپ خانہ اور سپاہیوں کو لے کر شہر پہنچ گئے اور میٹھادر کے ٹالپروں کے سرکاری سپاہیوں سے ہتھیار چھین لئے اور وہاں انگریز سپاہی بٹھائے۔اور پھر چاوڑی میں سرخ وسفید سات پٹیوں والا لہراتا ہوا بلوچی جھنڈا اتروادیا۔اور اس کی جگہ یونین جیک'' لہرایا

گیا۔اور دفتروں میں پڑا ریکارڈ سیل کیا گیا۔ کھارا در تک جا کر قلعہ کی دیواروں پر انگریزی سپاہی تعینات کیے گئے۔اور دیواروں پر توپیں نصب کی گئیں۔اس کے بعد کیپٹن پریڈی نے دوبار چاوڑی پہنچ کر اعلان کیا کہ کراچی پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا ہے۔

شہر کو وقتی طور پر سیٹھ ناؤمل کے حوالہ کر دیا گیا تھا۔اور چوکیوں کی نگہداری ایک انگریز سارجنٹ کے ذمہ لگائی گئی تھی۔ ٹالپر سرکار کے اہل کاروں کو گرفتار کیا جا چکا تھا۔

کچھ عرصہ بعد جب چارلس نیپرء کو سندھ کا گورنر بنا دیا گیا تو اس نے کیپٹن کو کراچی کا کلکٹر مقرر کیا۔اور اسے ٹاسک دیا کہ کراچی کو ایک فری پورٹ بنانے پر عمل کرے۔کیپٹن پریڈی نے تمام دریائی ٹیکس ختم کر دیئے اور گرفتار بلوچوں کو بلا کر ان سے چھینا گیا اسلحہ جو تلواروں اور بندوقوں پر مشتمل تھا ان کو لوٹا دیں۔ "دی سندھ سٹوری" کے منصف کیول رام رتن مل ملکانی لکھتے ہیں کہ چارلس نیپئر نے بلوچ جنگجوؤں کو ان کا اسلحہ واپس کیا اور انہیں کہا کہ میری اطاعت کرو اس کے علاوہ جو تمھارا جی چاہے کرو۔لوٹ مار، قتل، کسی چیز پر پابندی نہیں۔جب تک میں منع نہ کروں۔اور انہوں نے یہی کیا وہ

لکھتے ہیں کہ نیپئر کراچی کو ملکہ مشرق کہتے تھے۔انہوں نے کراچی میں پہلا تجارتی میلہ منعقد کرایا۔جس نے ہندوستان اور پورے وسطی ایشیا کو متوجہ کرلیا۔انہوں نے کراچی کو سندھ کا دارالحکومت قرار دیا۔اور وائسرائے کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انگلستان سے آنے والے تمام جہاز پہلے کراچی بندرگاہ پر ٹھہریں اور بعد میں بمبئی جائیں۔اس اقدام سے کراچی ایک بڑے تجارتی شہر بننے کی طرف گامزن ہوگیا۔اور پھر کراچی کراچی بن گیا۔

کراچی کو 1948ء میں ایک قرارداد کے ذریعہ سندھ سے الگ کردیا گیا۔سندھی اور بلوچ قوم پرست لیڈروں نے اسے ''قانونی ڈکیتی'' کا نام دیا۔اور ملک کے لئے ''بے دستور ریاست'' کی اصطلاح استعمال کی اور جس قرارداد کے ذریعہ کراچی کو سندھ سے کاٹا گیا اس قرارداد کو ''غیر قانونی قانون'' کہا گیا۔اور پھر یہ بلوچی اور سندھی ملک ہڑپ ہوتا گیا۔

''بلوچ اور پشتون کی ملی وحدت کے تاریخی شواہد'' پر ایک نظر

روزنامہ آساپ کے 7فروری2006کے شمارہ میں جناب سلطان محمد صابر صاحب کا مضمون بعنوان ''بلوچ اور پشتون کی ملی وحدت کے تاریخی شواہد پڑھنے کو ملا جس میں کئی تاریخی نکات پر غیر تاریخی موقف اختیار کیا گیا ہے جیسے کہ سلطان صاحب نے وضاحت کی ہے کہ افغان ، پٹھان اور پشتون یا پختون ایک قوم کے تین نام ہیں جنہیں ہر پختون اپنے قومی تعارف کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مذکورہ وضاحت ایک نقطہ نظر ضرور ہے لیکن تاریخی حقیقت نہیں ہے۔ تاریخی لحاظ سے افغان ایک الگ قوم ہے۔ ہزاروں سالوں سے جس کی زبان وراثتاً فارسی رہی ہے۔ یہ قوم نسلاً بنی اسرائیل ہے جو کلی طور پر خانہ بدوش قوم رہی ہے۔ جہاں تک پختونوں کا تعلق ہے تاریخی لحاظ سے یہ لوگ پکت یا پخت خطے کے قدیم آریائی باشندے تھے ۔ پخت سے باہر کے لوگ '' پخت کی نسبت سے انہیں پختو کہتے تھے جس کے معنی ''پخت والے''۔ پختو زبان کے بھی یہی معنی یعنی پخت والی زبان کے ہیں۔ پختو بطور واحد بولا جاتا ہے جبکہ جمع اس کی

پختون ہے۔ جو خطہ آجکل افغانستان کہلاتا ہے یہ صدیوں تک زیادہ تر ترکوں کا علاقہ رہا ہے۔ قندھار سے جنوب کی طرف زیادہ تر کرد رہتے تھے لیکن ترک بھی ہوتے تھے۔ قدیم زمانے میں ان ترکوں اور کردوں کے علاقوں میں پختون یا پشتون نہیں ہوتے تھے۔ صرف افغان ہوتے تھے۔ ترک اور کرد بعض حروف نہیں بول سکتے تھے۔ ترک ''ف'' کی جگہ ''پ'' اور ''غ'' کی جگہ ''گ'' ادا کرتے تھے اس طرح کرد ''ف'' کی جگہ ''پ'' بھی بولتے تھے لیکن ''پ'' کی نسبت ''و'' زیادہ آسانی سے ادا کر سکتے تھے۔ وہ اپنی کردی زبان (موجودہ بلوچی زبان) میں ''ف'' کی جگہ ''و'' بولتے تھے۔ وہ شف کو شپ کی بجائے ''شو'' اور شف کور کو ''شوکور'' آج بھی بولتا ہے۔ ایسے کئی الفاظ ہیں۔ افغان ان کی ادائیگی میں اوگان بنتا تھا۔ اسی لئے شاہنامہ فردوسی میں افغان کو ''اوگان'' اور ''اپگان'' کہا گیا ہے۔ جہاں تک لفظ ''پٹھان'' کے استعمال کی بات ہے اس پر ہم نے کوئی تحقیق تو پڑھی نہیں ہے لیکن ہندوستانیوں کی زبانی سنا ہے کہ جب پختون لوگ کوہ سلیمان کے اطراف میں پھیل کر پھر ہندوستان کے جاٹ علاقوں میں پہنچ گئے تھے تو جاٹ لوگ پختون نہیں بول سکتے تھے وہ انہیں ''پہتان'' بولتے تھے لیکن زیادہ ''دیر تک'' ''پہتان'' کا ''ت'' وہ اپنی زبان پر برقرار

نہیں رکھ سکے اور اسے ''پٹھان'' بنا بیٹھے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان ہی کے لوگ پختون کو پٹھان کا نام دیتے آئے ہیں۔ جناب سلطان صابر صاحب نے شاہنامہ فردوسی کے جن اشعار کو نقل کیا ہے۔ وہ قدرے غلط ہیں۔ صحیح اشعار یوں ہیں:۔

نزدیک زابل بہ سہ روزہ راہ
یکے کو ہ بود سر کشیدہ بہ ماہ
بہ یک سوئے آں دشت خرگاہ بود
دگر دشت زاں ہندواں راہ بود

ترجمہ:۔

''زابل سے تین دن کی مسافت پر ایک سر بفک پہاڑ (یعنی چلتن) تھا جس کی چوٹی چاند کو چھوتی تھی۔ اس پہاڑ کے ایک طرف دشت خرگاہ (وادی مستونگ) تھا۔ اور دوسری طرف ایک دشت واقع تھا جہاں سے ہندوستان کو راستہ جاتا تھا''۔ یہ دشت چلتن کا مشرقی میدان ہے جس کا مغربی حصہ دشت کمبیلا اور مشرقی حصہ دشت سپیزنڈ کہلاتا ہے اس کے پھر دو حصے ہیں جو قدیم کردی (موجودہ بلوچی) میں دشت زنڈین اور دشت گوئنڈین کہلاتے ہیں یعنی بڑا دشت اور چھوٹا دشت۔

شاہنامہ فردوسی دونوں دشتوں کی نشاندہی کرنے کے بعد ہندوستان کی شاہراہ پر واقع دشت میں آباد خانہ بدوش قوموں کا ذکر کرتا ہے۔

نشستہ دراں دشت بسیار کوچ

زافغان ولاچین وکرد بلوچ

(شاہنامہ فردوسی کے ایک قدیم منقش طہران چھاپ نسخے میں ((کرد بلوچ درج ہے)۔

ترجمہ:۔

اس دشت میں کئی خانہ بدوش آباد ہیں جو افغان ،لاچین اور کرد بلوچوں سے ہیں۔

شاہنامہ میں کہیں بھی پختون یا پشتون کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ صرف افغان کا ذکر ہے۔ جو پختون یا پشتون سے الگ قوم اور نسل ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ قبائل آس پاس پھیلتے گئے اور پختون بھی پخت/ پکت اور کوہ سلیمان کے دامان سے دائیں بائیں پھیلتے گئے اور صدیوں بعد قندھار اور اس کے گردنواح میں پہنچے اور افغان کے ساتھ خلط ملط ہوگئے جس کے نتیجے میں کئی افغان گھرانے پشتو بولنے لگے اور کئی پختونوں نے فارسی زبان اپنالی۔ پشتو زبان اپنانے کے بعد آہستہ آہستہ یہ افغان اپنے کو پشتون

کہلانے لگے اور بعض نے زبان اپنانے کے باوجود اپنے لئے افغان کے قومی نام کو بہتر جانا اور افغان کہلواتے تھے۔ شمالی بلوچستان اور جنوبی افغانستان کے خطوں میں پشتون نام زیادہ پرانا نہیں ہے اور افغان خود پشتو بولنے والے کو افغان نہیں بلکہ پشتون اور پختون کہتے تھے آج بھی افغانستان میں افغان صرف فارسی بولنے والوں کے لئے مستعمل ہے۔ پختونوں کے لئے نہیں۔ لیکن افغانستان میں بود و باش رکھنے اور صدیوں سے افغان حکمرانوں کے ماتحت ہونے کی بنا پر پختون اپنے کو از خود افغان سمجھتے اور کہتے ہیں۔ یہ سیاسی اور سماجی طور پر افغانوں سے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک افغانستان کے افغانوں کا تعلق ہے تاریخ میں ثابت ہے کہ قدیم زمانے میں بھی ایک چھوٹی سی اقلیت اس خطے میں بود و باش رکھتی تھی لیکن بنیادی طور پر وہ بھی باہر سے آئے ہوئے تھے اور افغانستان کے اصل باشندے زیادہ تر ترک اوکم تر کرد ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے زمانہ قدیم میں کسی بھی علاقے کا نام افغانستان نہیں بن سکا تھا۔ زمانے کے انقلابات اور نشیب و فراز نے زمین کے دونوں قدیم وارثوں کو اپنے قدیم خطے سے باہر پھینک کر اپنے وطن سے بے وطن کر دیا تھا۔ اور کابل اور قرب جوار کے بیشتر علاقے بنی اسرائیلی افغانوں کے قبضے میں آ گئے تھے اور اب اقلیت

میں رہ جانے والے ترک اور کرد افغان بن چکے تھے۔ لیکن افغان نسل کی کوئی حکومت یا بادشاہت کبھی نہیں بن سکی۔ حکمران پھر بھی باقی ماندہ ترک نسل اور قبیلوں سے ہوتے تھے۔ غزنوی، غوری، زابلی، غلزئی اور درانی (افتالی/ابدالی) وغیرہ سب ترک قبیلے اور ترک حکمران ہیں۔ احمد شاہ ابدالی وہ واحد ترک نسل کا آخری سردار تھا۔ جس کو سرداری اور حاکمی کے لئے ترک قوم کی بجائے افغان قوم ملی۔ ''زبان خلق نقارہ خدا است'' کے مصداق احمد شاہ ابدالی یا درانی بھی افغان کہلائے۔ لسانی لحاظ سے یہ سب فارسی بولنے والے تھے۔ جو ان کے خاندانوں کی زبان ہوتی تھی۔

پختون اور افغان جس طرح تاریخی اور تہذیبی لحاظ سے مختلف ہیں اسی طرح دونوں کے قد کھاٹ، بدنی ساخت اور شکل وشباہت میں بھی کوئی مماثلت نہیں ہے۔ قبائلی تنظیم میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پختون میں قبیلہ خیل سے بنتا ہے جبکہ افغان نے بلوچوں کا زئی اپنایا ہے جو یقیناً زمانہ قدیم کے بلوچوں سے متاثر ہو کر اپنایا گیا ہے۔

اس مختصر سے جائزہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار سالوں سے قدیم شال کے خطے میں افغان اور بلوچ ساتھ ساتھ تھے۔ جبکہ پختون یا پشتون اس خطے میں صدیوں بعد ظاہر ہوئے تھے۔ افغان بھی شاید اس خطے

میں تھوڑے ہوتے تھے۔ کیوں کہ قدیم تواریخ جس میں شاہنامہ فردوسی کے بیان کردہ واقعات کے حوالے بھی شامل ہیں ہمیں بتاتے ہیں کہ یہاں (چلتن کے آس پاس) ایک ککّ کوہزادنامی افغان پہلوان ہوتا تھا۔ جس کا اپنا قلعہ تھا اس کی بڑی دہشت قائم تھی اور اس کی دہشت صرف بلوچ سپاہ کی بدولت قائم تھی جو وہ دشت خرگاہ (وادی مستونگ) سے چن چن کر لے آیا تھا۔ بلوچ ہی اس کی فوج تھی اور انہی کی طاقت کے بل بوتے پر وہ زور آزمائی اور بدمعاشی کرتا تھا۔ ملاحظہ ہو شاہنامہ:۔

دگر آں کہ درکوہ بہ آں دلیر
ہزار اند جنگی ہمہ ہمچو شیر

یعنی اس بہادر ککّ کے ساتھ پہاڑوں میں ہزاروں جنگجوئیں ہیں۔ جو شیر کی طرح دلیر اور لڑاکو ہیں۔

کزیں کردہ گرو ہے زہر کشورے
کہ ہر یک فزون است از لشکرے

''اس لشکر میں ہر علاقے کے گروہ لائے گئے ہیں کہ ان کا ہر گروہ یا دستہ ایک فوج پر بھاری ہے''

یہ طاقتور اور جنگجوں کون تھے اور کہاں سے لائے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

با ہر یکے لشکر صد ہزار

سوار ہا و پیادہ بلوچان کار

یعنی اس لشکر کا ہر دستہ میدان کارزار کو لتاڑنے والے ہزاروں سوار اور پیادہ بلوچوں پر مشتمل ہے"۔ میدان کارزار کو لتاڑے والے یہ شمشیر زن بلوچ کہاں کے تھے۔ شاہنامہ کک کو ہزاد کی نسل اور قوم کے بیان میں اس کی بھی وضاحت کرتا ہے۔

نژادش ز افغان سپاہ اش بلوچ

ابر دشت خرگاہ بہ گزیدہ کوچ

(شاہنامہ کے ایک 1905ء کے دہلی چھاپ نسخہ میں دوسرا مصرعہ یوں ہے

"ابر دشت خرگاہ گزیدہ بہ کوچ"

یعنی وہ نسلاً افغان تھا لیکن اس کی فوج بلوچوں پر مشتمل تھی جو دشت خرگاہ (وادی مستونگ) سے چن چن کر لائے گئے تھے۔" یہ افغان و بلوچ کی قدیمی باہمی اعتماد کا ثبوت ہے۔

سلطان صابر نے آگے بلوچوں کی مرکزی ایشیا سے خانہ بدوش قبائل کی شکل میں بلوچستان میں ہجرت کی بھی بات کی ہے۔ تقریباً دو ہزار سال پہلے تاریخ کوئٹہ اور مستونگ کی وادیوں میں بلوچوں کی موجودگی ثابت کرتی

ہے۔اگر یہی بلوچ مرکزی ایشیا سے ہجرت کر کے آئے بھی تھے تو تاریخ نے اسے ثابت نہیں کیا ہے۔صابر صاحب کی ہجرت کی بات ایک مفروضہ اور قیاس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

اسی طرح کاسی نامی قوم کی فلسطین سے بلوچستان میں کوئی ہجرت ثابت نہیں ہے جو کانسی قبیلہ کوئٹہ میں رہتا ہے،اور اب پشتو زبان اپنانے کی وجہ سے پشتون کہلاتا ہے قدیم قبیلہ نہیں ہے۔کوئٹہ میں قلعہ کانسی کی اراضی نصیر خان نوری نے خضدار کے اور ناچ علاقے سے آنے والے کچھ کرد گھرانوں کے رہنے کے لئے دیا تھا جو کاسئی کرد کہلاتے تھے۔جس قبیلہ کو وہ فلسطین سے نکلنے والے کاسئی کہتا ہے۔جس کا کوئی تاریخی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔وہ درحقیقت کاسئی کرد ہیں۔جنہوں نے مرور زمانہ پشتو زبان اپنالی ہے۔قبیلے کا اصل نام کاسئی ہے۔ کاسی اور کانسی بگڑے ہوئے جدید نام ہیں۔کانسی قبیلہ سے متعلق پشتو کہاوتوں میں بھی انہیں کاسئی ہی کہا جاتا ہے۔موجودہ چند وقت سے قبل کاسی قبیلہ پشتونوں سے زیادہ رشتہ داریاں نہیں کرتا تھا بلکہ بلوچوں ہی سے رشتے ناطے کرتا آیا ہے یہ چیز بھی نسلی کشش کا پتہ دیتی ہے۔

جہاں تک بلوچوں کی باہر سے ہجرت کی بات ہے وہ تقریباً ایک مفروضہ ہے۔ بلوچی تاریخ اور یادداشت میں صرف رند قبائل اور ان کے کچھ ساتھی قبیلے ملک

اومان اور شام کے حلب سے مہاجرت کر کے مکران میں داخل ہوئے تھے۔اور یہ چودھویں صدی عیسوی کے وسط کی بات ہے۔لیکن اس سے پہلے مکران، جھالاوان اور شال و مستونگ کے آس پاس بلوچ من حیث القوم آباد تھے۔ اس قدیم تر زمانے میں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ پیغمبری میں مکران کے موجودہ ضلع گوادر کے دشت اور اس کے مغربی خطوں میں بلوچ موجود تھے اور نمرود بلوچ ان کا سردار تھا۔جس نے اپنے طاقتور بلوچ لڑاکوؤں کے ساتھ کالدیا کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور طاقت کے غرور میں آ کر خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا اور مشرکین میں شامل ہوگیا۔وہ کالدیا کا پہلا طاقت ور ترین شہنشاہ بنا (دشت کے سنٹسر کے مقام پر نمرود بلوچ کے قلعہ کے آثار آج بھی موجود ہیں) اُس زمانے کو غالباً چار سے ساڑھے چار ہزار سال کا عرصہ بن جاتا ہے۔یعنی ساڑھے چار ہزار سال سے مغربی مکران مین بلوچ ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے وجود رکھتا تھا۔جو کہیں باہر سے نہیں آئے تھے۔اگر کسی بعد کے دور میں کچھ بلوچ قبائل یا گروہ بلوچستان آئے بھی تھے تو وہ انہی بلوچوں کی نسل ہوتی تھی۔جو نمرود بلوچ کی کالدیا پر حکمرانی کے زمانے میں مکران ہی سے چلے گئے تھے تا کہ شاہی اور خوشحالی کی زندگی سے لطف اندوز ہوں۔نمرودی شہنشاہیت کے خاتمے کے بعد وہی جانے والے لوگوں کے پسماندگان واپس مکران کا رخ کرتے تھے۔

کیچ

کیچ، مکران کے وسیع و عریض مملکت کا صدیوں تک دارالحکومت رہا ہے۔ جو اپنی قدامت کے لحاظ سے قدیم ترین تہذیبوں کے خزانے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں پر ''کے'' خاندان کے شہنشاہوں خسرو، کاؤس اور بہمن کے نام سے منسوب کاریزیں اور قلعے موجود ہیں۔ قدیم مہم جو قبائل کی آبادکاری کے آثار ان قبائل کے ناموں کی صورت میں اس سرزمین پر جابجا ملتے ہیں۔ جیسے کول، مید، ماد، بل، کورنگ، گور، بہمن، ناگ وغیرہ وغیرہ، تاریخی مشہور رومان سسی پنوں کے ہیرو پنوں ہوت کا تاریخی قلعہ اسی مقام پر موجود ہے۔ حال ہی میں آثار قدیمہ کے ماہرین نے اس مقام کی کھدائی کر کے قدیم ترین تہذیبوں کا پتہ چلایا ہے۔ اور اس مقام کو سندھ کے تاریخی مقام موہنجوداڑو سے قدیم ترین بتایا ہے۔

پانچویں صدی عیسویں سے لے کر پندرہویں صدی عیسوی کے وسط تک کیچ کی حیثیت ایک ملک اور بین الاقوامی تجارتی منڈی کی رہی ہے۔ جہاں پر مغرب و مشرق سے تجارتی قافلوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ نزہت المشتاق میں شریف ادریسی لکھتے ہیں کے کیز (کیچ کا مغرب) مکران کا سب سے بڑا شہر

ہے جو طول و عرض اور آبادی کے لحاظ سے ملتان کے برابر ہے۔ یہاں کھجور کی پیداوار کثرت سے ہوتی ہے اور زرخیز زمینوں کا خطہ ہے۔ تجارت بڑی ہوتی ہے اور چیزوں کی قیمتیں مناسب ہیں۔

کیچ کا نام تاریخی بلوچ قبیلہ ''کوچ'' کے نام پر ہے۔ جو بلوچی کے مشرقی یا رندی لہجے میں کیچ ادا کیا جاتا ہے۔ بلوچی زبان میں ''و'' کا ''ی'' میں بدل جانے کے بارے میں پچھلے صفحات میں لکھا جاچکا ہے۔ کوچ یا کیچ قبائل کا تذکرہ تقریباً تمام مصنفین نے کیا ہے۔ عربوں نے ان کا تذکرہ قفص و البلوص اور ایرانیوں نے کوچ و بلوچ کے نام سے کیا ہے۔ قفص دراصل کوچ کا مغرب ہے۔ بعض ایرانی مصنفین نے کیچ یا کوچ کو کفج بھی لکھا ہے۔ بعض نے ان کو دو قبیلے کوچ اور بلوچ لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔ ان کو یہ غلط فہمی ''و'' کو ''اور'' کے معنی پہنانے سے ہوئی ہے۔ جیسے کہ فارسی میں اس کے معنی بنتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اس کا استعمال فارسی میں نہیں بلوچی میں ہوا ہے۔ بلوچی زبان میں ''و'' فارسی کے زیر کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو ''کا'' کے معنی دیتا ہے۔ کوچ و بلوچ کے بلوچی میں معنی بلوچ (قوم) کا کوچ (طائفہ) کے بنتے ہیں نہ کہ کوچ اور بلوچ کے جیسے کہ مصنفین نے اخذ کئے ہیں۔ آج بھی بلوچی زبان میں ''و'' کا استعمال اسی

طرح موجود ہے۔ مثال کے طور پر خرز، خواب خرگوش، شاہ قلندر، شاہ جہان، چشم ظاہر، صدق دل الفاظ کے لئے بلوچ میں خروز، واب دکر گوشک، شاہ قلندر، شاہ وجہان، چم وظاہر، ستک ودل یادل وستک بولا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کوچ و بلوچ کی ادائیگی بلوچی میں رہی ہے۔ جس سے مراد" کوچ بلوچ" ہیں نہ کہ کوچ اور بلوچ، اس کی تصدیق تاریخ سیستان (بہ تصحیح ملک الشعراء بہار) سے بھی ہوتی ہی۔ جس میں مذکور ہے کہ کوچ ایک گروہ تھا جو کرمان ومکران و بلوچستان کے حدود میں سکونت رکھتا تھا اور غالباً یہ بلوچ کے مترادف تھا۔ یہ طائفہ قدیم ایام سے راہزنی اور سرکشی میں شہرت رکھتا تھا اور بڑے بڑے بادشاہان وقت ان سے نبرد آزما رہے ہیں۔ یہ طائفہ محمود غزنوی کی حکومت کے بعد رو بہ زوال ہوا اور بتدریج کوچ کا نام درمیان سے گم ہوا اور فقط بلوچ کا نام باقی رہ گیا۔"

کرمان اور مکران کے ساحل کے بیچ وسیع پہاڑی علاقے ان بلوچوں کے مسکن تھے۔ جنہیں عرب مورخ جبال قفص لکھتے ہیں۔ اس پہاڑی خطے کا مرکزی مقام ان کے اپنے نام سے منسوب تھا۔ یعنی کیچ یا کوچ۔ نزہتہ المشتاق کوچ قبائل کے علاقے کی حدود اس طرح بیان کرتا ہے:۔

''ان کے پہاڑ خلیج فارس تک پہنچتے ہیں شمال کی
طرف نجرمان تک ، جنوب اور مشرق کی طرف
سمندر تک اور مکران کے صحرا تک، مغرب کی طرف
سمندر اور ملک بلوچ، ماتبان اور ہرمز تک''۔

جی پی۔ٹیٹ نے اپنی تصنیف ''سیستان'' میں عرب جغرافیہ نویسوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ کوچوں کا وطن جیرفت کے جنوب سے لے کر مکران کے ساحل تک تھا اور شمال میں خراسان تک اور مغرب میں فارس تک تاخت و تاراج کرتے تھے۔عرب مصنفین نے مذکورہ بالا علاقوں میں واقع پہاڑوں کو جبل قفص لکھا ہے۔یعنی یہ پہاڑی علاقے کوچوں کے پہاڑ کہلاتے تھے۔ قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنی تصنیف خلافت امویہ اور ہندوستان میں لکھا ہے کہ بلوچستان کے ساراوان اور جہلاوان کی پہاڑیوں کو عربوں نے جبال قفص کہا ہے۔جو کہ بالکل غلط اور قیاس پر مبنی بات ہے۔عرب مصنفین نے نہ صرف جبال قفص کے حدود بتائے ہیں بلکہ نقشے بھی دیئے ہیں۔ساروان اور جہلاوان کی پہاڑیاں تو جبل قفص سے سینکڑوں میل دور واقع ہیں۔اس کے علاوہ کوچ قبیلہ اور اس کے طائفوں کے قدیم آثار آج بھی موجود ہیں۔ جن سے ان کے قدیم مراکز اور مساکن کا پتہ چل جاتا ہے۔مثال کے طور پر

کیچ کا مرکزی مقام جو اس قبیلے کے اپنے نام پر ہے اور اس مقام کے آس پاس موجود ان کی عظمت رفتہ کی یادگاریں ہیں۔ جن میں کوچ قلات بمعنی کوچ قلعہ، جواب کوش قلات کہلاتا ہے، قابل ذکر ہے۔ اسی طرح اس کا ایک ذیلی طائفہ ''تربہ'' ہوتا تھا۔ جس کے نام سے کیچ کا ضلعی صدر مقام ''تربت'' ہے۔ جو اسی نام سے آج تک موجود ہے۔

شریف ادریسی نے کوچ قبائل کی زبان کے متعلق لکھا ہے کہ'' قفص، کرمان کی واحد قوم ہے جو فارسی نہیں بولتے'' واضح ہو کہ جو زبان مکرانی بلوچی کہلاتی رہی ہے اسکا ایک نام کوچی اور کیچی رہا ہے۔ جو کیچ یا کیچ قبائل کی نسبت سے ہے۔ آج بھی یہ بلوچی '' کیچی'' کہلاتا ہے۔ جو اگرچہ بلوچی زبان سے الگ کوئی زبان نہیں ہے لیکن بلوچی زبان کے مشرقی اور رخشانی سے معمولی سا مختلف ہے۔ خود کیچ میں ہی کیچی لہجہ الگ ہے اور رخشانی لہجہ الگ ہے۔ یہ سرحدی رندی لہجہ سے بھی قدرے مختلف ہے۔ اسی بناء پر دسویں صدی عیسوی کے بعض عرب اور ایرانی مصنفین کو لکھنا پڑا کہ کوچوں کی زبان الگ ہے۔ حالانکہ یہ زبان نہ پہلے الگ تھی۔ نہ آج الگ ہے۔ صرف لہجہ قدرے مختلف ہے اور بعض اشیاء کے نام رندی بلوچی اور رخشانی بلوچی سے مختلف نام ہیں۔

کوچ قبائل کی شورش پسندی کی وجہ سے مختلف اوقات میں ان پر حملے ہوتے رہے ہیں۔ اسلامی دور میں بھی ۲۳ ہجری سے لے کر ۴۷۵ ہجری تک برابر کوچوں پر حملے ہوتے رہے ہیں اور وہ مرتے رہے ہیں۔ لیکن زیر نہ ہو سکے۔

جب اسلامی لشکر نے سہل بن عدی کے سپہ سالاری میں کرمان پر حملہ کیا تا کہ مقامی باغیوں کا قلع قمع کیا جا سکے تو کوچ قبائل نے کرمانیوں کی بھرپور مدد کی۔ تاریخ طبری میں امام محمد بن جریر طبری نے لکھا ہے کہ اسلامی فوج نے کیچ قبائل کے سرکشوں کو سبق سکھانے کے لئے جبال قفص میں ان کی آبادیوں پر حملے کئے۔ اور ان کو شکست دی۔ اسی شکست کے نتیجے میں اسلامی افواج کو بھیڑ، بکریوں، گھوڑوں اور اونٹوں کی شکل میں کافی مال غنیمت ہاتھ لگا۔ دوسری مرتبہ پھر ۳۱ ہجری میں کیچ پر حضرت مجاشعہ کی سرکردگی میں کوچوں پر حملے ہوئے۔ اسی حملے میں عربوں نے کوچ قبیلہ کے متعدد قلعوں پر حملے کئے اور خاص کر کیچ قلعہ پر حملہ کر کے اسے منہدم کر دیا۔ لیکن اس پر پورا قبضہ نہ کر سکے۔

کیچ پر اپنا مکمل قبضہ کرنے کے لئے عربوں نے کیچ گاؤں کے نزدیک اپنا ایک نیا قلعہ تعمیر کرایا جو ''الجوسق'' کہلایا۔ ''جوسق'' عربی زبان

میں قلعہ کو کہتے ہیں۔ یہ قلعہ صدیوں تک قائم رہا۔ زمانے کے حوادث نے اس کا نشان مٹا دیا لیکن اس کا نام نہیں مٹا سکے۔ آج بھی قدیم کیچ قلعہ کے مشرقی سائیڈ پر قدرے فاصلے پر سرسبز گاؤں آباد ہے جو اس قلعے کی نسبت سے آج بھی جوسق کہلاتا ہے۔ یہ جوسق اگلے کئی زمانوں تک کیچ بلوچوں اور عربوں کے درمیان مسلسل مسلح کشمکش کا باعث بنا رہا۔ تاوقتیکہ اس پر مسعود غزنوں کے حملوں کے زمانے میں بلوچوں کا قبضہ ہو گیا۔

شال

شال، موجودہ کوئٹہ کا قدیم نام رہا ہے۔ جسے انگریز رائیٹروں نے کوئٹہ لکھ لکھ کر ہمیشہ کے لئے کوئٹہ بنا دیا۔ حالانکہ انگریزی قبضہ کے وقت یہ شال ہی کہلاتا تھا۔ جس کا تاریخی قلعہ ''شالکوٹ'' اور مشہور تاریخی درّہ ''شال درہ'' کے نام سے موسوم رہے ہیں۔ تاریخ میں یہ نام بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں نظر آتا ہے۔ مغربی بلوچستان کے زابل کے قرب وجوار میں آباد سیستانی بلوچ قبائل میں شال قبیلہ موجود تھا۔ جبکہ اس دور میں کوئٹہ کے کھلے دشت کے مواضع میں ''شال'' کا نام نظر نہیں آتا تھا۔ یا پھر تحریر میں نظر انداز تھا۔ یہ دشت سبی سے بلیلی اور مستنج تک والشتان کہلاتا تھا۔ قیاس یہی ہے کہ بارہویں صدی عیسوی کی شروعات میں یہ بلوچ قبیلہ ایرانی سیستان کے بلوچی علاقے سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوا تھا اور یہاں کے قدیم تُورانی قلعہ پر تصرف کر بیٹھا جو پھر اس قبیلے کے اپنے نام پر شالکوٹ کہلایا۔

نئے انگریزی متعارف کردہ نام کوئٹہ کے بارے میں گزیٹر میں بتایا گیا ہے کہ شال قلعہ کو افغان لوگ کوئٹہ Quetta کہتے تھے اس لئے یہ نام کوئٹہ مشہور ہوا ہے لیکن یہ اُن سینکڑوں مفروضوں کی مانند ایک مفروضہ ہے

جو علاقائی ناموں کے بارے میں پھیلائے گئے ہیں۔ان مفروضوں میں ایک مفروضہ شاہ افغانستان احمد شاہ ابدالی سے منسوب بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کوئٹہ کا علاقہ میر نصیر خان بلوچ کی والدہ کو بطور شال سوغات کیا تھا۔اس لئے یہ ''شال'' کہلایا۔جو ایک غلط اور بے بنیاد بات ہے۔علاقائی نام ایسے میں رائج نہیں ہوتے۔کوئٹہ دراصل کوتہ کی بگڑی صورت ہے۔یہ لفظ قدیم کردی (موجودہ بلوچی) زبان کا لفظ ہے جو اس صاف اور ہموار میدان کو کہتے ہیں جہاں پر اناج کو صاف کرنے کے لئے جو ہان یا ڈھیر کیا جاتا ہے۔صرف جوہان یا اناج کے ڈھیر کو بلوچی میں ''کوت'' کہا جاتا ہے۔

کوئٹہ کا موجودہ مرکزی علاقہ جس میں جناح روڈ، پرنس روڈ، سائنس کالج اور سول اسپتال کا ایریا شامل ہے، وہ ہموار میدان ہوتا تھا جہاں پر زمیندار لوگ اناج کے فصل کی کٹائی کے بعد اسے صاف کرنے کے لئے لاکر ڈھیر کرتے تھے۔اسی نسبت سے یہ مقام ''کوتہ'' کہلاتا تھا۔جسے اب کوئٹہ کے لہجے میں بولا جاتا ہے۔ابتدا میں صرف یہی قطعہ زمین جو اب بازاروں پر مشتمل ہے ''کوتہ'' کہلاتا تھا اور قلعے کا علاقہ موجودہ ہائی کورٹ اور ٹی وی اسٹیشن تک جو اب چھاؤنی میں شامل ہیں ''شال کوٹ'' کہلاتا تھا۔یعنی ''شال قوم کا قلعہ''۔1876ء تک جب انگریزوں نے کوئٹہ پر

قبضہ کیا تو یہی دو جگہیں اپنے انہی قدیم ناموں سے معروف تھے اور پورا علاقہ ''شال'' کہلاتا تھا اور کوئٹہ اس کے لئے مستعمل نہیں تھا۔ جیسے کہ ہم نے اوپر سیستانی بلوچوں کے حوالہ سے کہا ہے کہ ''شال'' بلوچوں کے ایک قدیم قبیلہ کا نام تھا۔ جو اس خطہ زمین کا تاریخی وارث تھا۔ جس کا تاریخی قلعہ اپنے وقت میں اس خطے کا سب سے بڑا قلعہ شمار ہوتا تھا جو شال کوٹ یعنی شال قوم کا قلعہ مشہور تھا۔ اس قلعہ کی تیسری منزل پر حاکم کا محل ہوتا تھا۔ جو میری کہلاتا تھا۔ بلوچی زبان میں میری سے مراد ''میر یا حاکم کی رہائش گاہ'' کے ہیں۔ یہ علاقہ اور میری اپنے قدیم بلوچی ناموں سے کوئٹہ چھاؤنی میں آج بھی کھنڈر کی شکل میں موجود ہے۔ یہ مقام قدیم شال کوٹ کا مرکزی جگہ ہے۔ زمانے کے حوادث اور تنگ حالات کے پیش نظر شاید یہ قبیلہ ہندوستان ،صوبہ سرحد اور مزید شمال کے آباد علاقوں کی طرف ہجرت کرتا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عربوں کے جنگی لشکروں کے ساتھ مستوج جیسے اپنے کئی دیگر بلوچ قبیلوں کی سنگت میں شال لوگ بھی ساتھ چلے گئے ہوں۔ کیونکہ صوبہ سرحد اور کشمیر کے خطے تک کئی تاریخی بلوچ طائفوں کی آبادکاری کے آثار اور شواہد موجود ہیں۔ جن میں بلوچوں کا یہ بہادر طائفہ بھی شامل ہے۔

۱۲۰۰ء میں خضر خان بلوچ نے جن پانچ ہزار بلوچ جنگجو لشکر کے

ساتھ جیسلمیر اور کھڈال پر حملہ کیا تھا تو اس کے بلوچ لشکر میں شال طائفہ کے لڑاکو بھی شامل تھے۔ موجودہ وقت میں اس بلوچ طائفے کے چند گھرانے ایرانی سیستان میں اور کافی گھرانے کشمیر کے خطے میں موجود ہیں۔

اپنے قدیم تاریخی وطن کوئٹہ میں شال قبیلہ کے باقیات سولہویں صدی عیسوی کے نصف کے بعد نمایاں نہیں رہے۔ بعد کے ادوار میں اگر اس کے چند گھرانے اپنے وطن میں رہ بھی گئے تھے لیکن ان کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔ گمان غالب ہے کہ یہ اقلیت میں رہ کر نو واردوں میں مدغم ہوئے اور گمنام ہوئے۔ البتہ 1511-1510ء کے لگ بھگ جب شاہ بیگ ارغون، بابر مرزا کے حملے کے خوف سے قندہار سے بھاگ کر شال آیا اور اسے اپنی قلمرو کی راجدھانی بنا دیا تو شال قلعہ کی قریبی آبادی پر حملہ کر کے اسے بے دخل کیا تو یہ مظلوم اور لٹے پٹے بلوچ مستونگ اور منگچر کو ہجرت کر گئے۔ جہاں پر وہ ''شالی'' کہلاتے تھے۔ یعنی ''شال'' کے لوگ۔ گمان غالب یہی ہے کہ یہ شال قبیلہ کے باقیات ہی تھے۔ یہ شالی آج منگچر کے لانگو بلوچوں کی شاخ کے طور پر موجود ہیں اور وہ آج بھی کوئٹہ اور خاص کر بُدّہ کے ایریا کو اپنا بتاتے ہیں۔ شال کا یہ تاریخی خطہ ہزاروں سالوں سے ضرب وحرب کا میدان بنا رہا ہے۔ تورانی پہلوان ڈیڑھ صدی تک اس

سرزمین پر اپنی طاقت کے مظاہرے کرتے رہے ہیں۔ 550 قبل مسیح میں ایرانی وتورانی جنگجو نے اسے لتاڑتے رہے۔ان قدیم رزم آرائیوں کے تذکروں میں اس وادی میں بلوچ قوم کی آبادیوں اوران کے قلعوں کے تذکرے ملتے ہیں۔شاہنامہ فردوسی میں وادی شال اور مستونگ میں بلوچ لڑاکوؤں کے تذکرے فخریہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔جس سے تقریباً ڈھائی ہزار سالوں سے اس وادی میں بلوچوں کی بودوباش کا ثبوت ملتا ہے ۔قدیم ترین بلوچ جنگجو قبیلوں میں قبیلہ ''سرپرہ'' ابھی تک وادی مستونگ میں آباد ہے۔جواس خطّے کے قدیم ترین وارثوں سے ہے۔

شال کا خطہّ صدیوں تک مختلف حکمرانوں اوران کے ممالک کے ماتحت رہا۔جن میں کیانی ،غزنوی،غوری ،ارغون ،مغل ،ابدالی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔1545ء میں جب ہمایوں بادشاہ دوبارہ برسراقتدار آیا تو انہوں نے بلوچوں کے بیش بہا احسانات کے اعتراف کے طور پر شال اور مستونگ کا خطہّ ایک بلوچ سردار میر لونگ خان بلوچ کو عنایت کیا۔جس نے مستونگ کا قدیم قلعہ ''گنج ماڑی'' اور شال کا قدیم بلوچی قلعہ ''شالکوٹ'' کی ازسرنو مرمّت وآرائش کی اورانہیں مسلح فوجیوں کی حفاظت میں دیا تھا۔

کوہستان خضدار کی رابعہ

بلند و بالا پہاڑوں کے بیچ میں گھری خضدار کی چھوٹی سی سرسبز وادی تاریخ کے قدیم شہروں میں سے ایک ہے جو قدامت کے اعتبار سے بغداد، قندھار، کیچ، ارمابیل، قندابیل، اروڑ اور ملتان کی ہم عصر ہے۔ قدیم تاریخی واقعات کے ضمن میں جہاں جہاں مندرجہ بالا شہروں اور مقامات کا تذکرہ آتا ہے وہاں لازماً خضدار کا بھی نام آتا ہے۔ جو اپنے وقت میں نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ درہ مولا کی قدیم تاریخی شاہراہ کے دہانے پر ہونے کی بنا پر کسی بھی عہد میں اس کی اہمیت کم نہ ہوئی۔ لیکن یہ شاید اس عظیم مقام کی بدنصیبی رہی ہے کہ تاریخ کی کُتب میں اسے وہ جگہ نہ مل سکی جس کا وہ مستحق تھا۔

تاریخ میں خضدار کا تفصیلی ذکر نہ ہونے کی اصل وجہ یہی ہے کہ خود اس کے اپنے باسی تعلیم سے بے بہرہ تھے جو اس کے بالادست اور کرتا دھرتا تھے وہ تمام کے تمام غیر مقامی ہوتے تھے اور غیر مقامی ہونے کے ساتھ ساتھ تحریر کی اہمیت سے وہ بھی غالباً ناواقف تھے۔ جنہوں نے نہ صرف اتنے بڑے تاریخی مقام اور اس میں پیش آنے والے واقعات اور تاریخی

لڑائیوں کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود اپنے بارے میں بھی کوئی قلمی نقش آنے والوں کے لئے نہیں چھوڑا۔ ان کی دلچسپی محض اپنے اقتدار اور شان وشوکت کے استحکام اور مقامی وسائل کے زیادہ سے زیادہ حصول تک محدود تھا۔ اس المیہ نے اس سرزمین کے بڑے بڑے تاریخی واقعات اور قابل قدر شخصیات کو گمنامی کے پردے میں ڈھانپ دیا ہے۔ آج ہم تک جو تھوڑی بہت معلومات پہنچی ہیں وہ یا تو قدیم بلوچی شاعری کے ذریعہ پہنچی ہیں یا تو پھر مقامی روایات اور کہانیوں کی شکل میں دستیاب ہیں بہت ہی کم معلومات عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے چند سطور میں لکھ چھوڑے ہیں انہی پر اہل قلم کا اکتفا ہے۔

رابعہ بنت کعب قزداری جیسی بلند مرتبت شخصیت کے بارے میں بھی تاریخی کتب ہمیں بہت ہی کم معلومات فراہم کرتی ہیں۔ جسے فارسی جیسی عظیم الشان زبان کی پہلی شاعرہ اور ملک توران کے عرب حاکم امیر کعب کی جلیل القدر شہزادی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ رابعہ قزداری کی زندگی کے مختصر حالات وواقعات اور شاعری کا بہت ہی تھوڑا حصہ درج ذیل چند کتب اور رسائل کے توسط سے دنیا کے سامنے آئے ہیں۔

ا۔ مجمع الصفا ازعلی قلی ہدایت، تہران۔

۲۔ الٰہی نامہ ازمولانا شیخ فریدالدین عطار، تہران۔
۳۔ زبان سخنور ازاکبر سلیمی، تہران۔
۴۔ نفحات الانس ازمولانا جامی۔
۵۔ لباب الالباب.....محمد عوفی، ایران۔
۶۔ تاریخ ادبیات ایران.....ڈاکٹر ذبیح اللہ، ایران۔
۷۔ شعرائے بزرگ ایران.....ہوشنگ مستوی۔
۸۔ وطن رابعہ بنت کعب (مضمون) ڈاکٹر عبدالشکور احسن۔ قاہرہ

پاکستان میں جن محققین نے رابعہ قزداری کے بارے میں تھوڑی بہت تحقیق کی اور اہل بلوچستان اور پاکستان کو خضدار کی اس عظیم شخصیت کے بارے میں قدرے معلومات دیں، ان میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے اپنی دو کتابوں ''تذکرہ صوفیائے بلوچستان'' اور ''بلوچستان میں فارسی شاعری'' میں رابعہ خضداری کو متعارف کرا کر احسان عظیم کیا۔ جن دیگر اہل قلم نے اس عظیم شاعرہ پر لکھا۔ ان میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری ،رضا ایزادی ہمدانی ،پروفیسر انور رومان ،اور راقم الحروف شامل ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں خضدار میں راقم الحروف ہی کی کوششوں سے ''رابعہ خضداری آرٹس اکیڈمی'' کا قیام عمل میں آیا۔ اکیڈمی نے ۱۹۸۲ء میں ایک

سیمنار کا انعقاد کیا جس میں خضدار اور رابعہ خضداری کے بارے میں مقالے پڑھے گئے ۔اکیڈمی نے بھی رابعہ بنت کعب کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات اکھٹی کیں۔

رابعہ،توران کے عرب حاکم معین بن احمد کے خضدار میں متعین کردہ مقامی والی امیر کعب کی لاڈلی بیٹی تھی ۔معین ابن احمد سامانیوں کی طرف سے ملک توران کا حاکم تھا جو خود عرب نسل سے تھا اور سامانیوں کا معتمد تھا اور خود کیکاناں (مشتمل بہ خاران وقلات) میں مقیم تھا۔

امیر کعب نے ایک عرب حاکم کے ناطے اپنی بیٹی کو حکومتی اور حربی معاملات سے دور نہیں رکھا تھا بلکہ اپنا شریک کار بنایا تھا اور اس وقت کے تقاضوں کے مطابق اُسے ایک استاد اور مرشد صوفی کے زیر تعلیم رکھا تھا جس نے نہ صرف رابعہ کو عربی اور قرآنی علوم کی تعلیم دی بلکہ اسے تصوف کے مقام اور مسلک سے بھی آگاہ کیا۔رابعہ نے اپنے اور اپنے والد کے استاد اور مرشد سے باطنی فیض حاصل کیا اور عشق حقیقی کے حامل سینکڑوں عربی اشعار حفظ کئے اور ان کی تفسیریں سیکھیں۔یہی وہ بنیادی علوم تھے۔جنہوں نے بنت کعب کو اپنے زمانے میں زین العرب بنا دیا تھا۔وہ جلد باطنی اسرار ورموز سے آگاہ ہوئی اور عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف چل پڑی۔

زمانے نے اس کے ساتھ بھی وہی کچھ کیا جو دیگر عشاق کے ساتھ کرتا رہا ہے لیکن دنیا اس کی روح کی تڑپ اور سچائی کو دبا نہ سکی اور وہ رابعہ جسے اپنے غلام بکتاش کے ساتھ محبت کرنے کے الزام میں موت کی وادی میں سُلا دیا گیا عاشقان حقیقی کی صفوں کی پہچان بن گئی۔ رابعہ بنت کعب خضداری کے اشعار میں موجود سوز و گداز اس کی منزل کی خود نشان دہی کرتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ عشق مجازی میں ایسا کمال پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے وہ کہتی ہے۔

عشق دریائی کرانہ ناپدید
کی توان کردن شنا ای مستمند

رابعہ خضداری فارسی زبان کے ابوالآ بارودکی کی ہم عصر تھی۔ رودکی کو رابعہ کی شاعری کے ''کمال'' نے اتنا متاثر کیا کہ اس نے شاعری میں نام و پیام کیا اور محض رابعہ کو دیکھنے اور سننے کے شوق نے اُسے بخارا کے شاہی دربار تک رسائی کرائی جہاں اس نے رابعہ کے اندر کے سوز کو محسوس کیا اور اس کے عشق سے باخبر ہوا۔

رابعہ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ وہ فن سپاہ گری میں بھی شاعری کی طرح یکتا تھی۔ حکومتی امور میں اس کے مشورے ہمیشہ شامل حال ہوتے تھے۔ اپنے خاندانی غلام بکتاش سے اس

کی محبت کی لازوال داستان یوں بیان کی جاتی ہے۔

رابعہ کا بھائی حارث اپنے والد کعب کی وفات کے بعد اس کی جگہ والی تھا اور پورے دبدبہ سے حکومت چلا رہا تھا سوائے ایک خاندانی غلام بکتاش کے کسی کو اس کی خلوتوں میں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بکتاش ایک غلام تو ضرور تھا لیکن شاہی خانوادے کا رازدار بھی تھا اور شکل وصورت میں بھی خوب تھا۔ ایک رات حارث نے شاہی باغ میں ایک جشن کا انعقاد کرایا۔ شعروموسیقی کی محفل جوبن پر تھی۔ باغ کے کسی کونے میں رابعہ بھی اپنی سہیلیوں اور کنیزوں کے ساتھ موجود تھی اور اس محفل سے مسرور تھی۔ جشن کے دوران بکتاش نے بھی غزل گوئی کی۔ وہ مے نوشی کی وجہ سے مدہوش تھا اور اس مدہوشی کے عالم میں خوبصورت غزل گوئی کر رہا تھا کہ رابعہ نے اس پر توجہ کیا۔ اس سے پہلے رابعہ، غلام کی اس صفت سے باخبر نہیں تھی نہ جانے وہ کونسا انداز تھا جس نے رابعہ کے دل میں غلام کے لئے جگہ بنالیا۔ رابعہ اندر ہی اندر آتش سوزاں سے جلتی رہی اور سوز وگداز عشق کو شاعری میں ڈھالتی رہی۔ جب عشق کی تپش لاوا بن کر باہر نکل آئی تو ایک کنیز کو شک گذرا تو اُس نے رابعہ سے پوچھ ہی لیا۔ رابعہ نے بہت عرصہ بعد اس کا اظہار اس کنیز سے کر دیا۔ اور بکتاش کی محبت میں کہے گئے

اشعار اس کے ذریعے بکتاش کو بھجوائے۔

کہتے ہیں کہ بکتاش کے دل میں رابعہ کی محبت پہلے سے موجزن تھی لیکن ایک غلام ہونے کے ناطے اس کو اظہار محبت کا حوصلہ کبھی نہ ہوا۔ اور درحقیقت رابعہ کی محبت ہی نے بکتاش کو شاعر بنا دیا تھا۔ جس سے درباری شرفاء بھی اُسے غلام ہونے کے باوجود عزت دیتے تھے۔ رابعہ کے بھائی حارث کو تو اس پر نہایت ہی اعتماد تھا۔

رابعہ اور بکتاش کے درمیان شاعری میں پیغامات کا سلسلہ چل رہا تھا اور دونوں کی راز دار فقط ایک کنیز تھی۔ جب روبرو ملاقات کی نوبت نہ آئی تو بکتاش سے رہا نہ گیا اور ایک دن جب رابعہ باغ میں کنیز کے ساتھ ٹہل رہی تھی بکتاش نے اس کا دامن پکڑ لیا اور کہا کہ یہ کیسا عشق ہے جس میں جدائی ہی جدائی ہے یہ جدائی مجھے جلا کر راکھ کر رہی ہے اسے ختم کر دو۔

رابعہ کو غلام بکتاش کی اس سُبک حرکت سے بہت رنج ہوا۔ اس نے بکتاش کو کہا کہ محبت نام ہی اس سوز کا ہے جس کے بغیر عشق کا تصور ہی محال ہے۔ رابعہ نے بکتاش سے کہا اے حسین بکتاش! محبت کو محبت ہی رہنے دے اسے ہوس کا شکار نہ کر اور وہ دامن چھڑا کر چلی گئی۔

رابعہ کے بھائی کو بکتاش کے ساتھ بہن کی محبت کا علم اُس وقت ہوا جب شاہی خزانے کے کسی صندوق سے رابعہ کے کچھ اشعار برآمد ہوئے جو بکتاش کے نام تھے۔ شاید بکتاش انہیں کسی صندوق میں رکھ کر بھول چکا تھا۔ حارث نے رابعہ پر سختی کی اور غلام بکتاش کو زیرِ زمین ایک گرم حمام میں قید کر دیا۔ رابعہ نے بھائی کو سچ سچ بتا دیا اور کہا کہ بکتاش سے میری محبت عشق حقیقی کی محض سیڑھی ہے میں بکتاش میں کسی اور معشوق کا نظارہ کرتی ہوں لیکن بھائی نے ایسی مجنونانہ باتوں پر توجہ نہ کی اور اس کو بھی قید تنہائی میں بند کروا دیا۔

کچھ عرصہ بعد بھائی نے بہن کی خبر لی۔ اُسے تہہ خانے سے نکلوا کر پھر اس سے حقیقت حال پوچھا۔ اس بار رابعہ نے بھائی کو سختی سے جواب دیا۔ کہا کہ جب تو عشق کو جانتا اور سمجھتا ہی نہیں ہے تو اتنا سمجھ کہ میں بکتاش کا سچا عاشق ہوں جو سزا چاہے دے دے۔ حارث کچھ بھی سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ رابعہ ایک شاہزادی ہے جس نے ایک غلام سے محبت کر کے اس کے عربی غیرت کو للکارا ہے۔ چنانچہ حارث نے شاہی سرجن سے رابعہ کی ایک رگ کٹوائی اور پھر اسے تہہ خانے میں بند کرا دیا۔ رابعہ اسی رگ سے بہنے والے خون سے اپنے عشق کے سوز و گداز کو

تہہ خانے کی دیواروں پر اشعار کے روپ میں لکھتی رہی ۔تا آنکہ وہیں معشوق حقیقی سے جاملی۔

رابعہ کی موت کی خبر سارے توران و بلخ و بخارا میں پھیل گئی ۔غلام بکتاش کو بھی رابعہ کے مرنے کی خبر ملی ۔کسی نہ کسی طور پر وہ تہہ خانے سے باہر نکلا اور رابعہ کی قبر پر جو محل کے قریب بنائی گئی تھی جا کر سینہ میں خنجر گھونپ کر گر پڑا۔غلام بکتاش کو شہر سے باہر اور رابعہ کی قبر سے دُور ویرانے میں دفن کی گیا۔ رابعہ خضداری کی دلگداز داستان کے بارے میں تھوڑی بہت روایتیں ملتی ہیں لیکن اس کی زندگی کی داستان اور شاعری وغیرہ کے بارے میں بیشتر چیزیں پردے میں ہیں ۔اہل خضدار رابعہ خضداری کو بی بی ستی جتی کے نام سے جانتے ہیں ۔اس کا مزار تو نظر نہیں آتا لیکن ایک قبر کی ہموار جگہ کو لوگ بی بی کی قبر مانتے ہیں جس کے اردگرد پتھروں کے ڈھیر رکھ کر نشانی چھوڑ دی گی ہے ۔خضدار کوشک (محل) کی میری کے شمال میں ایک ڈھیری کے نیچے یہ ہموار قبر کی جگہ موجود ہے جسے رابعہ خضداری اکیڈمی والوں نے قدرے نمایاں کیا ۔اس جگہ بلوچ لوگ آج بھی آتے ہیں ،خیرات رکھ کر جاتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں ان کی دعائیں بر بھی آتی ہیں ۔بلوچ لوگ عاشق غلام کی قبر سے واقف نہیں ہیں لیکن موجودہ کٹھان

میں ندی کے کنارے ایک نہایت قدیم قبر کا پتہ دیتے ہیں جس کا بیشتر حصہ پانی کے کٹاؤ کی زد میں آ کر نابود ہو چکا ہے اور اس کا بہت کم حصہ رہ گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً کسی کا مقبرہ ہے۔ آدھی رات کے بعد اسی قبر سے روشنی کا ایک شرارہ اوپر اٹھتا ہے اور خضدار میری کے نیچے "بی بی ستی جتی" کی قبر پر اُتر کر غائب ہو جاتا ہے پھر علی الصبح وہی شرارہ واپس اپنے ٹھکانے پر آ کر غائب ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور اس کے گواہ بیسویں لوگ ہیں۔ صبح کی نماز کے لئے اٹھنے والے کئی لوگ اس ملاپ کا نظارہ کر کے عاشقوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ روحانی طاقتوں پر یقین رکھنے والوں کو پورا پورا یقین ہے کہ یہ قبر اسی بی بی ستی جتی کے دوست کی قبر ہے۔ اگر خضدار کے بلوچوں کی بی بی ستی جتی وہی رابعہ خضداری ہے تو پھر کٹھان کا مدفون عاشق لازماً بکتاش ہوگا۔

نیست مرکِ بر عاشق آن ءَ

زندگ اَنت آ ہر زمان ءَ

بی بی ستی جتی کو خضدار کے بلوچ خضدار کے ایک پرانے زمانہ کی بادشاہ کی شاہزادی سمجھتے ہیں جس نے اپنے خوبصورت غلام سے محبت کی اور اس سے شادی کرنے پر اصرار کیا۔ جبکہ بادشاہ نے اپنی زندگی میں اس کی

منگنی کر یکا تھاں کے ایک خوبصورت شاہزادے سے بڑی دھوم دھام سے کرو یا تھا۔ لیکن بیٹی نے اس منگنی کو قبول نہ کیا اور بھرے دربار میں ایک شعر پڑھا جس میں کہا گیا تھا کہ وہ ہزاروں شہزادے اپنے غلام محبوب پر قربان کرو ے گی۔ وہ شادی اسی سے کریگی وگرنہ تمام عمر ستی بن کے رہیگی۔

باپ کی موت کے بعد اس کے بھائی نے بی بی اور اس کے غلام کو دو الگ الگ کنویں کھدوا کر ان میں بند کردیا۔ اور اوپر سے کنوؤں کو ڈھانپ دیا۔ جب بھائی ایک لڑائی میں مارا گیا تو گھر والوں نے دونوں کنویں کھلوادیں اور بی بی کی لاش کو محل کے نیچے دفنا دیا۔ جبکہ غلام کی لاش کو محل سے دور ایک ویرانے میں جا کر دفنایا جہان سے اُس وقت سے لے کر آج تک روشنی کی ایک لکیر نکل کر بی بی ستی بختی کی قبر میں اُتر جاتی ہے اور صبح ہوتے ہی واپس اپنے ٹھکانے میں چلی جاتی ہے۔

رابعہ خضداری کی قبر کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ بعض روایتیں ہیں کہ کنویں سے اُس کی لاش نکلوا کر غسل وغیرہ دے کر اور دلہنوں کی طرح سجا کر اپنے ملک لیجایا گیا اور میری کے نزدیک محض اُس کی یادگار بنادی گئی جو پھر زیارت کا درجہ پا گئی۔ جبکہ بعض روایتیں اس سے اختلاف کرتی ہیں۔ ان کے مطابق بی بی کے خاندان میں سے کسی نے اُسے قبول

نہ کیا اور اس کی لاش اسی کنویں کو بھر کر اس کی اوپری سطح پر دفن کی گئی۔ اور ایران اور افغانستان کے تین مقامات پر اُس کی زیارتیں مقبروں کی صورتوں میں بنائی گئیں۔ بلوچستان اور سندھ میں پُرانے وقتوں میں کئی آستانے اور یادگاری زیارت گاہیں قائم کرنے کا رواج عام رہا ہے یہ رواج اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر تک عام رہا ہے۔

رابعہ خضداری کی بہت کم شاعری منظر عام پر آ گئی ہے یہاں پر ہم وہ اشعار درج کئے دیتے ہیں جنہیں محترم ڈاکٹر انعام الحق کوثر صاحب نے اپنی مطبوعات میں نقل کی ہیں:-

مرابہ عشق ہمی متہم کُنی بہ حیل چہ حجت آری پیش خدای عزّ وجل
بہ عشقت بعداز عاصی ہمے نیارم شد بدینم اندر طاغی ہمی شوم بمثل

.....

دعوت من برتو آن شد کایزدت عاشق کناد
بر یکی سنگیں دل نا مہربان چوں خویشتن
تابدانی دردعشق وداغ مہروغم خوری
تاہجر اندر بہ پچی وبدانی قدرمن

.....

باز عشقت اندر آوردم بپند
کوشش بسیار نامد سود مند

عشق دریائی کرانہ ناپدید
کی توان کردن شتاب ای مستمند

عشق را خواہی کہ تا پایاں بری
بس کہ پندید باید ناپسند

زشت باید دید انگارید خوب
زہر باید خورد وانگارید قند

توسنی کردم نہ دانستم ہمی
کز کشیدن تنگ تر گردد کمند

....

زبس گل کہ در باغ ماوٰی گرفت
چمن رنگ ارژنگ مانی گرفت

مگر چشم مجنون بابر اندر ست
کہ گل رنگ رخسار لیلی گرفت

بمی ماند اندر عقیقین قدح
سرشکی کہ در لالہ ماوٰی گرفت

سر نرگس تازہ از زر و سیم
نشان سر تاج کسرٰی گرفت

چو رہبان شد اندر لباس کبود
بنفشہ مگر دین ترسا گرفت

بروئی نیکو تکیہ مکن کہ تا یک چند
بہ سنبل اندر پنہاں کنند نجم زُحل

ہر آئینہ نہ دروغ است آنچہ گفت حکیم
فمن تکبر یوماً فبعدِ عزٍ ذِلِ

کاشک تنم باز یافتی خبر دل
کاشک دلم باز یافتی خبر تن

کاشک کہ من از تو برستی بہ سلامت
اے افسوسا کجا توانم رستن

فشانداز سوسن وگل سیم وزر باد
زہی بادی کہ رحمت باد بر باد

براد از نقش آذر صد نشان آب
نمود سحر مانی صد اثر باد

مثالِ چشم آدم شد مگر ابر | دلیل لطف عیسیٰ شد مگر باد
که دربار ید ہردم درچمن ابر | که جان افزود خوش درشجر باد
اگه دیوانه ابرآمد چرابس | کند عرضه صبوحی جام زرباد
کل خوشبوئی ترسم آوردرنگ | نه این غماز صبح پرده درباد
برای چشم ھرنا اہل گوئی | عروس باغ راشد جلوه گرباد
عجب چون صبح خوشتر میبر دخواب | چرا افگند گل را درسیر باد

الا ای بادشب گیری پیام من به دلبربر | بگوآں ماه خوباں را که جان بادلبر بر
به قہرازمن فگندی دل بیک دیدارمہرویان | چناں چوں حیدر کراردرآن حصن خیبر بر
توچون ماہی اومن ماہی ہمی سوزم بتابه بر | غم عشقت نه بس باشد جفا بنہادی ازبربر
ستم چوں چیزی گشته بدان امید تاروزی | ززلفت برفتد ناگه یکی حلقه بچنبر بر
ستم گرگشت معشوقم ہمه غم زین قتل دارم | که ہرگز سودنکند کس بمعشوق ستم بر بر
اگرخواہی که خوباں رابه روی خود به ہجرآری | یکے رخسارخوباں رابدان خوباں برابر بر
ایامعظم بکاروحال عاشق گرخبرداری | سحرگاہاں نگه کن توبدان الله اکبر بر
مدارائے بنت کعب انده که یارازتو جداماند | رسن گرچه درازآید گذر دارو بچنبر بر

سہتی مراد

پنجاب کی سرسبز وشاداب سرزمین قدرتی حسن وخوبصورتی سے مالا مال ہے بلکہ یوں کہیئے کہ اس جنت ارضی پر قدرت اپنے پورے شباب پر محو خواب ہے۔ جہاں پر راوی، چناب، اور جہلم کی مچلتی، اٹھلاتی اور گاتی ہوئی لہریں دُکھے دلوں کو سکون کی وادی میں پہنچادیتی ہیں۔ وہاں پر حسن وعشق کی دلگداز کہانیاں، رنگین داستانیں اور بہار آفریں عشقیہ گیت لہروں کی لے پر رقص کرتی ہیں۔

ایسے ہی ایک سبزہ زار علاقہ ساندل بار میں ایک شہر رنگ پور واقع ہے جس کے گداز سینے میں مشہور بلوچ رومان سہتی مراد دھڑک رہا ہے۔

رنگ پور بہادر راجپوتوں کا مسکن رہا ہے۔ یہاں کے مکین بڑے نواب اور سردار ہوتے تھے۔ شاید اسی لئے اس شوخ اور چنچل شہر کو نوابوں کا شہر کہا جاتا رہا ہے۔ آجومہر، اس شہر کا بڑا رئیس ہو گذرا ہے۔ اس کا ایک بیٹا سیدا اور ایک بیٹی سہتی تھی۔ سہتی لڑکی کیا تھی ایک پری پیکر حور تھی۔ جس نے جوانی کی پُر بہار وادی میں قدم رکھتے ہی پورے پنجاب کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ جو بھی اُسے ایک نظر دیکھ لیتا وہ اپنا دل ہار بیٹھتا۔ رنگ پور کے راجپوت جھنگ کے

سیال راجپوتوں سے رشتہ داری میں زیادہ دور نہ تھے۔اس لئے آ جو مہر نے اپنے بیٹے سیدا کے لئے جھنگ کے مہر چوچک کی بیٹی کا ہاتھ مانگ لیا۔سیدا ہیر کو تو بیاہ لایا لیکن بدقسمتی سے ہیر کی سیدا سے بن نہ پڑی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ہیر، رانجھے کو دل دے بیٹھی تھی اور اپنا سب کچھ اپنے محبوب پر فدا کر بیٹھی تھی۔سہتی چونکہ ہیر کی نند تھی اس لئے وہ ہیر کو ہمیشہ طعنہ دیا کرتی تھی۔سہتی کی طعنہ زنی سے تنگ آ کر ایک دن ہیر نے سہتی کو بد عادی، کہ یا اللہ! سہتی کو بھی درد عشق میں مبتلا کر جیسے کہ تو نے مجھے مبتلا کیا ہے۔"

ہیر کی دعا بارگاہ الہیٰ میں قبول ہوئی۔اور سہتی نے عالم خواب میں ایک گھبرو جوان کو دیکھا جو اس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔

سہتی نے بچپن سے مراد بلوچ کا نام سن رکھا تھا۔اس نوجوان کی بہادری کی باتیں اس نے پہلے ہی سے سُن رکھی تھیں لیکن اُس کی صورت اُس نے کبھی دیکھی نہیں تھی۔رات کے دیکھے ہوئے خواب کے بعد جب صبح وہ بستر سے اٹھی تو اس کے گلابی لبوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ رقصاں تھی جو اس سے پہلے شاید کسی کو نظر نہ آئی تھی۔آج اُسے اتنی خوشی ہو رہی تھی شاید زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوتی ہوگی۔ایک مراد بلوچ کو اس نے خواب میں کیا دیکھا سپنوں میں ایک فلک نما محل تعمیر کی۔اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔اگر

مراد بلوچ اتنا ہی حسین وجمیل ہے جتنا کہ بہادر تو اُس کو پانے والا کتنا خوش نصیب ہوتا ہوگا۔لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ یہ خوش نصیب تو وہ خود تھی۔

آج کا دن سہتی کے لئے گویا کسی نے مراد کا پیغام لایا تھا۔دن چڑھا تو لوگوں نے رنگ پور میں خیموں کا ایک شہر دیکھا۔جس کے اردگر اونٹوں کی قطاریں ہی قطاریں تھیں ۔شہر سے لوگ ہجوم در ہجوم خیموں کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے۔جب سہتی کو پتہ چلا کہ دریا کے کنارے بلوچ سوداگروں کے قافلے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں تو وہ بھی اپنی سہیلیوں کو لے کر اس طرف آنکلی۔ٹہلتے ٹہلتے اور سیر کرتے اچانک اس کی نظر قافلے کے سردار سے ٹکرا گئی تو اپنی جگہ پر ساکت رہ گئی اور پھر خواب کی اُسی وادی میں پہنچ گئی جہاں پر اُس نے ہو بہو اسی خوبصورت گبھرو جوان کو دیکھا تھا پوچھنے پر سہتی کو پتا چلا کہ اس جوان کا نام مراد بلوچ ہے جو قافلہ کا سردار ہے ۔جو جتنا بہادر اور مہمان نواز ہے اتنا ہی حسین وجمیل ہے۔

جب قافلے کے سردار مراد بلوچ نے سہتی کو سہیلیوں کے جھرمٹ میں دیکھا جو اس چاند کی طرح لگ رہی تھی جس کے اردگرد تاروں کی مشعلیں روشن ہوں ۔تو اُس کا دل سینے میں مچلنے لگا۔مراد اپنا سب کچھ ہار چکا تھا۔اُس کی بیقرار نگاہیں لوگوں کے ہجوم میں دُور دُور تک سہتی کا پیچھا

کررہی تھیں۔عشق کے مارے سردار مراد کا تجارتی قافلہ جیسے شہر میں جم چکا تھا۔اور سہتی کے دل سے دن رات قافلے کی روانگی میں تاخیر ہونے کی دعائیں نکل رہی تھیں۔

کچھ دنوں تک دونوں کے مابین آنکھوں آنکھوں میں راز ونیاز کی باتیں ہوتی رہیں۔پھر محبت کے پیمان باندھے گئے۔آخر وہ روز سعید آہی گیا جب دو اجنبی دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے۔

دن گزرتے گئے۔کاروبار چلتا رہا۔عشق کی منزل قریب سے قریب تر آتی گئی۔قافلے میں سنسنی دوڑ گئی۔رنگ پور پر رشک وحسد کی چنگاریاں چمکنے لگیں۔جس مراد بلوچ پر جولوگ دل وجان قربان کرنے کو تیار تھے ان کی پیشانیوں پر بل آنے لگے۔لیکن دودلوں کا راستہ روکنے کی جرات کسی میں نہ ہوسکی۔ایک دن سہتی نے مراد سے پوچھا۔سردار کب کوچ کا ارادہ رکھتے ہیں۔

''جب بھی بڑا سردار حکم دے''۔مراد نے جواباً کہا۔پہلے تو سہتی حیران ہوئی پھر سوچا کہ شاید بلوچ سرداروں کے سردار بھی ہوا کرتے ہیں اوراسی طرح مراد کا بھی کوئی سردار ہوگا۔تاہم اُس نے پوچھا۔

''میرے سردار!مراد کا بھی کوئی سردار ہوگا۔''

''ہاں۔'' مراد نے مسکرا کر کہا۔ ''میں صرف ایک بلوچ قبیلہ کا سردار ہوں ۔میرے سردار تم ہو۔ جب حکم دو۔ چاہو تو کوچ کا حکم دو۔ چاہو تو قیام کا۔''

''سردار!۔۔۔۔۔۔۔'' سہتی اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں روشنی کی لکیر دوڑ گئی۔ خوشی سے گلاب سا چہرہ کھل اُٹھا۔ مراد نے اپنا سر اُس کے شانے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''سردار نہیں۔ مراد۔۔۔۔۔ صرف مراد۔''

مراد اور سہتی چوری چھپے رات گئے تک پیمان وفا باندھتے رہے۔ تادم مرگ ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے وعدے وعید کرتے رہے۔ اب یہ روز کا معمول بن چکا تھا کہ ہر رات کی تاریکی میں مراد اور سہتی کنویں کی منڈیر پر رات گئے تک بیٹھے رہتے اور محبت کو امر کرتے رہتے۔

ایک رات قافلے کی عائشہ نامی ایک دوشیزہ نے انہیں دیکھ لیا۔ عائشہ پہلے ہی سے مراد کو دل دے بیٹھی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر جل بھن گئی۔ اُس نے انتقام کا سوچا اور پھایاں نامی ایک بوڑھی کو کچھ لالچ دے کر سہتی کے والدین کو واقعہ کی اطلاح کرادی۔ جب سب حقیقت کھل گئی تو سہتی کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور اُسے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ مراد بلوچ اپنے خیمے میں سہتی کی جدائی کا غم سہتا رہا۔ کبھی

رات کی تاریکی میں نکل کر سہتی کے گھر کی دیواروں پر سر رکھ کر روتا رہتا اور کبھی کھیتوں کا رُخ کر کے آنسو بہاتا۔

ایک دن سہتی نے اپنی ایک سہیلی کے ذریعہ مراد کو کہلوا بھیجا۔

''سہتی تیرے فراق میں ساون کی گھٹا کی مانند روتی رہتی ہے۔ سہتی تیری ہے مراد! ہمیشہ تیری۔ اگر تم مجھے اپنا بنا سکتے ہو تو جلدی کرو ورنہ میرے لئے اس کال کوٹھڑی میں جینا دوبھر ہو جائیگا''۔

''میں تیرے بغیر کیسے اور کیوں کر زندگی گزار سکتا ہوں میں کسی دن ضرور تجھے لینے آؤں گا اور وہ دن دور نہیں۔ یہ ایک بلوچ کی محبت اور اس کا وعدہ ہے تم اپنے مراد کو مت بھولنا۔''

اور پھر اُسی رات مراد قافلے سے غائب ہو گیا۔ قافلہ والوں نے اُس کی تلاش شروع کر دی۔ شہر کا کونا کونا چھان مارا۔ لیکن مراد کہیں نہیں ملا۔ جب شہر میں مراد بلوچ کی گمشدگی کی افواہ پھیل گئی تو سہتی کو کال کوٹھڑی کی قید سے یہ سوچ کر آزاد کیا گیا کہ اب تو مراد جا چکا ہے اور کوئی دوسرا جوان ہے ہی نہیں جو اُس کی طرف نگاہ اٹھانے کی جرائت کر سکتا۔

اب سہتی ہیر کا درد اچھی طرح جان چکی تھی۔ وہی سہتی جو پہلے ہیر کو طعنہ دیا کرتی تھی اب اُس کی ہمدرد اور غمخوار بن چکی تھی۔ جب رانجھا در بہ در

کی ٹھوکریں کھاتا ہوا کئی سال بعد ہیر کی تلاش میں رنگ پور پہنچا تو اُس نے سہتی کی مدد سے ہیر کا قُرب حاصل کرلیا۔ اور ہیر کو بھاگنے کا مشورہ دیا۔ اور پھر سہتی سے یہ مدد چاہی کہ وہ یہ راز صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھے۔ سہتی ایک شرط پر راضی ہوگئی کہ مراد بلوچ کو اُس تک پہنچایا جائے گا۔ آخر رانجھا اور ہیر کی بڑی جدوجہد کے بعد مراد ان کو مل گیا جو اپنے قافلے سمیت چناب کے اُس پار سہتی کی جدائی کے دن کاٹ رہا تھا۔

سارے منصوبے مکمل ہو چکے تھے اب صرف جانے کی دیر تھی۔ یہ کام ہیر نے اپنے ذمہ لیا۔ ایک روز ہیر اپنی سہیلیوں کے ساتھ سیر کو نکلی۔ راستے میں کہیں جھاڑیوں میں اُس نے خود کو گرا کر بے ہوش کرلیا۔ سہیلیاں اُسے اٹھا کر گھر لے آئیں۔ ہوش آنے پر اُس نے بتا دیا کہ اُسے سانپ نے کاٹا ہے۔ سارے محلّہ میں سنسی دوڑ گئی۔ ہیر کے خاوند نے جس کی ٹکے کی بھی عزت نہیں تھی ہیر کی جان بچانے کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ سہتی نے اُسے مشورہ دیا کہ کالے باغ والے جوگی کو لے آئے جو سانپ کاٹے کا منتر جانتا ہے۔ سیدا بچارا مرتا کیا نہ کرتا۔

کالے باغ والا جوگی بڑی مشکل سے راضی ہوا اور کہا کہ ہیر کو شہر سے دور ایک خالی مکان میں منتقل کیا جائے تا کہ جوگی اطمینان سے اس کا

علاج کر سکے۔ جب ہیر کو شہر سے باہر ایک مکان میں منتقل کیا گیا اور سہتی کو مکان پر اُس کی رکھوالی کیلئے چھوڑ دیا گیا۔ رانجھا جو کہ جوگی کے روپ میں تھا نے جا کر مراد کو کہا کہ آج رات فلاں جگہ مکان پر آ جائے۔

سالوں سے بچھڑے ہوئے دوست مل گئے تھے۔ آدھی رات کو رانجھا ہیر کو لے کر ایک طرف نکل گیا۔ اور مراد بلوچ نے سہتی کو اونٹنی پر بٹھا کر سیدھا قافلے کا رخ کیا۔ اور مراد نے قافلے کو کوچ کا حکم دیا۔

صبح جب سیدا کوٹھی پر پہنچا تو کوٹھی خالی تھی۔ نہ ہیر تھی نہ جوگی اور نہ سہتی۔ چنانچہ رنگ پور کے کھیڑے اونٹنی کے پیروں کے نشانات پر چلتے ہوئے قافلے کا پیچھا کرنے لگے۔ جب سیدا نے راستے میں قافلے کو جا لیا تو ان پر ہلہ بول دیا۔ بلوچوں نے اپنے تیر کمان سنبھال لئے اور کھیڑوں پر تیر برسانے لگے۔ جب تعاقب میں آنے والے زخمی ہو ہو کر گرنے لگے تو اُن کے پاؤں اکھڑ گئے اور محبت کا یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوا۔

حضرت شہباز قلندرؒ بلوچستان میں

ہفت روزہ اخبار جہاں کے شمارہ 3 تا 9 مئی 2004 کے شمارے میں جناب خان آصف کا تحریر کیا ہوا مضمون ''حضرت لال شہباز قلندر'' پڑھنے کو ملا ۔ یہ موضوع پر تیسری قسط ہے۔ افسوس ہے کہ اس سے پہلے کی دو قسطیں میری نظر سے نہیں گذری ہیں لیکن حضرت شہباز قلندر کے کئی سوانح مختلف مصنفین کے ضبط تحریر میں لائے ہوئے پڑھنے کو ملے ہیں۔ جن میں بہت کچھ تشنگی پائی جاتی ہے ان کے بارے میں مصنفین کے لکھے ہوئے مضامین اور کتابوں میں جو مشترکہ کمی یا لاعلمی پائی گئی ہے وہ ہے ان کے بلوچستان میں قیام کے حالات اور واقعات۔ جن کی طرف کسی بھی مصنف نے توجہ مبذول نہیں کی ہے۔ بلوچستان کا ضلع پنجگور وہ خوش نصیب علاقہ ہے جہاں پر سندھ و ہند کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے اکثر اولیائے دین نے پہلا قدم رکھا ہے۔ یہاں اسلام کے شیدائیوں نے ہندوستان کی طرف محو سفر مجاہدین و مبلغین دین کو چند روز قیام کرنے پر اصرار کیا ہے اور اُن کی خدمت کرنے کو اپنے لئے باعث ثواب اور افتخار جانا ہے۔ یہاں کی سرسبز و شادابی، معتدل آب و ہوا بلوچوں کی خوشروئی، حد درجہ مہمان نوازی اور

پردیس جانے والے مسافروں کی عزت افزائی مشرق ومغرب کے آنے جانے والوں کو چند روزہ قیام پر مجبور کرتے رہے ہیں۔ یہ واحد علاقہ ہے جہاں قدم قدم پر صحابہ کرام، مبلغین دین ،مجاہدین اسلام ،زاہد وپیر وبزرگوں کے مزارات اور زیارت گاہیں ملیں گی۔

پنجگور کی اس سرزمین کے کئی مقامات پر حضرت شہباز قلندر کے قیام کی یادگاریں ملیں گی ۔دو مقامات تو خاص الخاص ان سے منسوب ہیں جہاں انہوں نے مقامی روایات کے مطابق مہینوں قیام کیا اور خلق خدا کی خدمت کی اور اللہ کی وحدانیت کا پرچار کیا اور دین اسلام کی روشنی سے علاقے کو منور کیا۔

پنجگور کے ضلعی مرکز میں رئیس قوم کا ایک قدیم شاہی موضع شاپاتان کے نام سے موجود ہے۔ یہاں پر ایک قدیم گنبد سر اُٹھائے عظمت رفتہ کی یاد دلاتا ہے۔اس گُنبد کے قرب وجوار کا علاقہ ''شاہ او قلندر'' (فارسی میں شاہِ قلندر) کہلاتا ہے یہ مقام حضرت شہباز قلندر کے قیام کی جگہ تھی جو کہ ابھی تک اُنہی کے نام مبارک سے منسوب ہے۔ پنجگور میں پہلا مقام جہاں پر حضرت شہباز قلندر نے اپنے مریدوں کے ساتھ پہلی دفعہ پڑاؤ ڈالا تھا وہ ایک وسیع وعریض میدان ہے جسے ''سیدان دشت'' کہتے ہیں۔

سیدان دشت پنجگور کی مرکزی آبادی سے بیس پچیس میل جنوب مغرب کی طرف پڑتا ہے۔ سیدان دشت کے جس حصے میں حضرت شہباز قلندر نے قیام فرمایا تھا اور ذکر الٰہی اور خدمت خلق میں مشغول ہوا تھا وہ رقبہ ان کے نام سے ''دشت شہباز'' کہلایا اور ابھی تک اسی نام سے منسوب ہے۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت نے سندھ جانے کے لئے اس دشت سے کوچ کرنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے ان کا راستہ روکا اور اصرار کیا کہ جتنا عرصہ حضرت نے اس ویران دشت میں قیام فرمایا ہے اب اتنا عرصہ وہ شاپاتان میں قیام فرمائیں تاکہ بڑی شہری آبادی اُن سے فیض یاب ہو سکے۔ حضرت قلندر نے لوگوں کی جو شدید محبت اور ان کا دلی لگاؤ دیکھا تو سندھ جانا وقتی طور پر موخر کر دیا اور شاپاتان میں قیام پذیر ہو گیا۔ انہوں نے شاپاتان میں کھجور کے ایک نخلستان میں قیام فرمانا پسند کیا جہاں پر ایک قدیم مسجد اور شہنشاہ کیکاؤس سے منسوب ایک قدیم قلعہ ہوتا تھا جو ویران اور زمین بوس تھا۔ یہاں پر عوام نے حضرت کے لئے ایک مٹی کا چھوٹا مکان بنایا۔ جس میں وہ رہنے لگے تھے۔ کچھ عرصہ بعد دور و نزدیک تک حضرت شہباز قلندر کی شہرت پھیل گئی اور دُور دُور کے علاقوں سے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ جب مسافر زیادہ آنے لگے تو حضرت نے مریدوں کے ذریعہ ایک لنگر کا

بندوبست کیا۔ جہاں پر مسافروں کو دو وقت کھانا ملتا تھا۔ اور ان کے رہنے کا بھی بندوبست تھا۔ مقامی بلوچ اس جگہ کو ''بنگر'' کہتے تھے۔ آج بھی یہ جگہ اسی نام سے معروف ہے۔

حضرت شہباز قلندر اُن دنوں شاہ قلندر اور شہباز قلندر مشہور تھے۔ بلوچی لہجے کا ''شاہ اوقلندر'' دراصل فارسی کا ''شاہِ قلندر'' ہے یعنی فقیروں کا بادشاہ۔ جو اُن کی بزرگی اور عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ ''شاہ قلندر'' کے خطاب کا اشارہ حضرت کی سوانح عمری میں بھی ملتا ہے ان کے ایک سوانح نگار الحاج شاہ مانا صاحب قادری لکھتے ہیں:-

> ''آپ کے والد سید کبیر نے خواب میں دیکھا کہ قلندروں کی جماعت دف بجا کر گارہی ہے اور بلند آواز سے کہتی جاتی ہے کہ سید کبیر کا بیٹا قلندروں میں ''امیر قلندر'' ہوگا۔ کچھ عرصہ بعد آپ پیدا ہوئے تو آپ کے والد نے گہوارہ میں آپ کی حرکات وسکنات کو دیکھ کر یقین کرلیا کہ

میر اخواب سچا تھا اور اس بچے میں

ابھی سے قلندرانہ رنگ دکھائی دے رہا ہے۔''

حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے خواب میں آپ کو سندھ جانے کی ہدایت کی چنانچہ آپ مکران کے راستے (پنجگور) سندھ کے لئے روانہ ہوئے۔ پنجگور میں قیام کے دوران آپ کی عقابی شخصیت اور کرامات کو دیکھ کر بلوچوں نے آپ کو شہباز کہا۔ وہ عقیدت ومحبت سے آپ کو ''لعل'' کہا کرتے تھے۔ واضح ہو کہ مکران کے بلوچ ہر ولی اور بزرگ شخصیت کو ان کے باطنی صفات کی وجہ سے ''لعل'' کہتے ہیں یعنی نور اور روشنی پھیلانے والا۔ اس طرح پنجگور کی سرزمین سے ''لعل شہباز'' کا بلوچی خطاب آخردم تک آپ کے نام کا لازمی جز بنا۔ اُن کے بعض سوانح نگاروں نے ''لعل'' کو لال لکھا ہے (جیسے کہ خان آصف کے مضمون میں بھی حوالہ دیا گیا ہے)۔ اور بیان کیا ہے کہ آپ لال لباس اور سرخ چیزیں پسند فرماتے تھے اس لئے آپ کو لال کہا گیا۔ یہ ایک مفروضہ اور غلط بیان ہے۔ آپ کے زمانے میں مروج زبان فارسی تھی اُردو نہیں تھی۔ اس لئے ''لال'' کے خطاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ خطاب بلوچی کا ''لعل'' ہے نیز یہ بھی ثابت ہے کہ مکران وارد ہونے سے پہلے آپ کے نام کے

ساتھ ''امیر قلندر'' اور شاہ قلندر مستعمل تھا۔ ''لعل شہباز قلندر'' نہیں تھا۔ یہ نام پنجگور میں دوران قیام آپ کے نام کا حصہ نا جوابھی تک ہے۔ دراصل مصنفین نے آپ کے پنجگور میں قیام کے دوران کے حالات و واقعات پر تحقیق ہی نہیں کی ہے تو پھر قلمبند کیا کرتے۔ مقالات الشعراء اور تحفۃ الکرام کے مطابق آپ 24-1223 عیسوی میں سندھ تشریف لائے اور سیوستان (سیوھن) میں قیام پذیر ہوئے جہاں آپ نے ۵-۱۲۷۴ء میں وفات پائی۔

الفت نسیم کا تعلق بنیادی طور پر ضلع پنجگور سے ہے اور موجودہ وقت میں خضدار میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش 1954ء ہے۔ کے پر آشوب دور میں بلوچی اور اردو شاعری سے کی۔ پھر بلوچی نثر اور افسانہ نویسی کی طرف متوجہ ہوئے، پہلا بلوچی مجموعہ کلام "آزگیں ریش" 1980ء میں شائع ہوا اور اسی سال بلوچی افسانوں کا مجموعہ "آجوئی ءُ گنوں" (آزادی اور بھوک) بھی منظر عام پر آ گیا جو بلوچی زبان میں افسانوں کا پہلا مجموعہ شمار کیا جاتا ہے۔ 1983ء سے وہ بلوچ اور بلوچستان کی تاریخ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور کئی تحقیقی مضامین و مقالے سپردِ قلم کیے۔ تاریخ کے شعبے میں ان کی کئی تصنیفات منظر عام پر آ کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ جن میں "ایک نظم ایک تاریخ"، "براہوئی کون" "کمبران"، "براہو جدگال جنگ و شیر" شامل ہیں۔

سندھ اور بلوچستان کی معروف بزرگ ہستی "صوفی فیصل فقیر لاشاری کی سوانح عمری اور عارفانہ کلام اور مقام ولایت پر انکی تحقیقی تصنیف "شاہ و سیر واہ" کے نام سے بلوچی میں ان کی اہم تصنیف ہے۔ نسیم صاحب بلوچ اور بلوچستان کی تاریخی تحقیقی معروفیات جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ محکمہ ایکسائیز و ٹیکسیشن بلوچستان میں شمالی علاقہ جات کے ڈائرکٹر ہیں۔

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ